دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ
معارف

جلد نمبر ۱۹۱ ماہ ربیع الاول ۱۴۳۴ھ مطابق ماہ جنوری ۲۰۱۳ء عدد ۱

فہرست مضامین

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

ہم نے دسمبر کے معارف میں اللہ رب العزت کی بارگاہ میں سپاس گذاری کی تھی کہ یہ محض اس کی توفیق بخشی ہے کہ معارف نے اپنی زندگی کی ۱۹۰ منزلیں طے کرلیں، اس شمارے نے ہمارے جذبہ شکر کو اپنے عاجزانہ اظہار کا ایک اور موقع دیا، یعنی اب معارف عمر کے ستانوے سال کا آغاز ایک سو اکیانویں جلد سے کرنے کی عزت حاصل کررہا ہے، فالحمدللہ علی ذلک۔

ہجری ہو یا عیسوی نئے سال کی آمد پر عام طور پر کچھ نئی امیدیں، خواب اور ارادے ہوتے ہیں جن کو سجا کر سال نو کا استقبال کرنے کی رسم ادا کی جاتی ہے، معارف کے شذرات میں کبھی کبھی اس ادائے رسم کے جلوے نظر آتے رہے، خصوصاً حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے قلم سے نئے سال کے استقبال میں چند جملوں میں ماضی، حال اور مستقبل کی تصویر کشی ایسی ہوتی جس کو دیکھ کر برسوں بعد آج بھی اس کی تازگی کا احساس، اس کی بازدید کے شوق کا سامان بن جاتا ہے جیسے جنوری ۱۹۴۱ء میں سید صاحب نے لکھا کہ دنیا کی تاریخ میں ایک نئے سال کا اور اضافہ ہوا لیکن اس اضافہ کا استقبال مسرت کے ترانوں اور خوشی کے نعروں کے بجائے مظلوموں کی آہوں اور بےکسوں کی فریادوں کے ساتھ ہوا، پوری دنیا اس وقت ایسی کشمکش کے گرداب میں ہے کہ اس کے مستقبل کا فیصلہ مشکل ہورہا ہے جو جیت رہے ہیں وہ ہار رہے ہیں جو ہار رہے ہیں وہ برباد ہورہے ہیں، ان لفظوں پر قریب ساٹھ سال گزر گئے لیکن کیا ایک حرف بھی بوسیدگی کے غبار میں دھندلا دکھائی دیتا ہے؟

گردش ایام سے پیچھے کی طرف لوٹنے کی خواہش ہمارے بڑوں نے بھی کی اس لیے اگر ہمارا دل کبھی کاروان رفتہ کی جرس کی صداؤں کو سننے، ان کے قدموں کے نشان گننے اور پس گرد کارواں کے حوصلوں اور ولولوں کی تابانی دیکھنے کی تمنا کرے تو اس کو بے جا نہیں کہا جاسکتا،

۲۰۱۳ء آیا تو خدا جانے کیوں ۱۹۱۳ء کی یادیں لایا، خصوصاً اس شخصیت کے حوالے سے جو آج سے سو سال پہلے کے منظر نامہ میں سب سے نمایاں اور روشن شناخت رکھتی تھی کہ جس کی زندگی کے سفر کے آخری پڑاؤ سے پہلے مشیت کے علم میں صرف ایک سال رہ گیا تھا اور وہ یہی ۱۹۱۳ء کا سال تھا، دل نے چاہا کہ علامہ شبلی کی عمر مستعار کے ۵۷ برسوں سے پہلے چھپنویں سال کا ایک جائزہ لیا جائے کہ یہ ایک عمر کی نواسنجیوں اور پرشور ساعتوں کے آخری لمحات تھے، ناتوانی اور ضعف اعضاء کا عالم یہ تھا کہ معمولی کھانے پینے کا انتظام بھی بار معلوم ہوتا تھا، صحت بد سے بدتر ہوتی جاتی تھی، بڑی حسرت سے زبان پر یہ حقیقت سامنے آتی تھی کہ ''اب اپنا سایہ رہ گیا ہوں''۔ نقاہت اتنی بڑھ گئی تھی کہ اپنے قلم سے خط لکھنا بھی دشوار تھا، تیل تمام ہو چکا تھا اور اب کچھ نہیں رہا تھا، بات کرنا بھی گراں گذرتا تھا، اپنے چراغ سحری ہونے کا یقین، اس طرح ظاہر کیا کہ اب زیادہ زندہ نہیں رہنا ہے، ایسے عالم میں بھی فکر تھی تو ملت کے تحفظ کی، ساری کوششیں اب بھی اسی مقصد کے لیے تھیں کہ ملت کے تن مردہ میں جان آجائے اور اس کے لیے جس نسخہ کیمیا کی ضرورت ہے اس کو ایک بار پھر پورے ایمان و یقین کے ساتھ پیش کیا جائے، ٹھیک سو سال پہلے تمام عارضوں کے باوجود سب سے بڑا فرض ادا کرنے کی کوشش سیرت النبیؐ کی تالیف تھی، کچھ نہ کچھ روز لکھتے اور اس کو عمر بھر کا حاصل اور وسیلہ نجات سمجھتے، المامون، الغزالی، شعرالعجم کی داستانیں اور ان کی مدح سرائیاں گرچہ اپنی تاثیر اور افادیت کا اعلان کر چکی تھیں لیکن ان کو آستان غیر سے تعبیر کر کے اسی ۱۹۱۳ء میں یہ قابل رشک اقرار ان کی زبان پر آیا کہ

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا

مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتمؐ
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

اس خاتمہ بالخیر کے لیے تڑپ کا یہ عالم کہ اپنے شاگردوں اور ملنے والوں سے بس یہی فرمائش تھی کہ وہ جہاں ہیں رخصت لے کر سیرت کے کام میں تعاون کریں، فتح مکہ تک کے حالات قلم کی نذر کر چکے تھے، مگر نظر ثانی و ثالث کی ضرورت محسوس کر رہے تھے، کبھی لکھتے کہ تاریخ خمیس کی دوسری جلد کی ضرورت ہے، عزیز ترین شاگرد سید سلیمان ندوی کو لکھتے کہ اگر کوئی کام نہ ہو تو سیرت النبیؐ کے دوسرے اجزا لے لیں، یورپ کے خیالات کا رد تالیف کا بڑا سبب تھا، یہ خیالات بڑے مطالعہ کے بعد ان کی نظروں میں تھے اور اس طرح تھے کہ سب تاروں کی ایک ہی صدا تھی

یعنی غلط فہمیاں، ناواقفیت اور تعصب، رہ رہ کر خیال آتا کہ یورپ کے ذخیرہ تاریخی پر الگ سے بحث ہو، پھر تقاضا ہوتا کہ عرب جاہلیت کی تاریخ ہو، عرب بائدہ سے زیادہ نجد، حجاز، یثرب کے متعلق معلومات بہم ہوں، مثلاً کعبہ کی آبادی اور حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کے واقعات کی تحقیق شدہ تفصیل ہو، شیخ عبدالوہاب کی کتاب الہدی النبیؐ اور ابراہیم بن عبداللہ کی تاریخ الاسلام کے متعلق سید صاحب کی رائے کا انتظار کہ کتاب کام کی ہے یا نہیں، رائے ملتی تو مطالعہ کر کے توجہ دلاتے کہ اس میں کوئی خاص بات نہیں، نئی کتابوں کی تلاش تھی، سمعانی کی انساب نظر آئی تو فوراً خرید کر خوشی کا اظہار کیا کہ نسخہ عمدہ ہے، ایک ایک دن گذرتا اور طبیعت کی بے چینی بڑھتی جاتی کہ کعبہ کی تعمیر کے ذکر میں حضرت اسماعیلؑ یا حضرت اسحاقؑ میں ذبیح کون ہے؟ ہمدانی حمیری کی کتاب صفۃ جزیرۃ العرب کیسے ملے گی؟ نولدیکی اور ولہاؤسن کا ترجمہ اس لیے کرایا کہ انگریزی ماخذ میں یہی مستند کہے جاسکتے ہیں، افسوس تھا تو اس کا کہ ڈاکٹر اسپرنگر کی کتاب سے فائدہ اٹھانے کا سامان نہ ہوسکا، پوچھ رہے تھے کہ جرمن، فرنچ اور انگریزی کی کون کون سی کتابیں اس موضوع پر ہیں اور جرمن سے ترجمے کا بندوبست کیا ہوگا، ایسی کتابیں ہوں جن میں فلسفیانہ طور پر مذہب اور اصول مذہب سے بحث ہو، یہ سیرت کی تالیف کی بے قراری تھی، دوسری طرف ندوہ، تعلیم، اشاعت اسلام، موتمر دینی عمومی، وقف علی الاولاد، مدینہ یونیورسٹی کے نصاب، کانپور کی مسجد کی شہادت، بلقان کے ترکوں کی طبی امداد، مدرسۃ الاصلاح نیشنل اسکول کے لیے کانفرنس کی اسکیم اور دارالمصنّفین کے باقاعدہ قیام، یہ ساری فکریں صرف ۱۹۱۳ء کی تقویم شبلی پر درج ہوتی رہیں، ہم جیسوں کے لیے یہ سال خودکسی صدی سے کم نہیں، یہاں گردش ایام سے پھر لوٹنے کی خواہش کا مقصد بھی عیاں ہے کہ کیا آنے والے سال میں جب شبلی صدی پوری ہوگی، اس کے لیے علی گڑھ، ندوہ، دارالمصنّفین، مدرسۃ الاصلاح، شبلی کالج اور ملک و بیرون ملک کے بے شمار اداروں کے لیے وقت نہیں آیا کہ شبلی کے تجدیدی کارناموں کو یاد کیا جائے، ان کو زندہ کیا جائے اور اس درد کو عام کیا جائے جس کو حیات شبلی کے سب سے بڑے نباض اور ترجمان نے ملت کی بربادی کے درد کا نام دیا تھا؟!۔

مقالات

باندیوں سے تمتع یا نکاح؟
(چند قرآنی وتفسیری مباحث)

پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمد شکیل اوج*

بالعموم باندیوں، لونڈیوں اور کنیزوں کے الفاظ کو ایک ہی مفہوم میں استعمال کیا جاتا ہے ۔اور ان مترادفات کو جس قرآنی تعبیر کے ترجمے کے طور پر بیان کیا جاتا ہے، وہ ما ملکت ایمانکم ہے۔زیر نظر مضمون میں ہم اس تعبیر کے معنی ومفہوم کے لیے ان ہی مترجم الفاظ میں سے کوئی ایک لفظ استعمال کریں گے۔واضح ہو کہ "ماملکت ایمانکم" کے الفاظ ضمائر کی ادنیٰ تبدیلی کے ساتھ پورے قرآن مجید میں پندرہ مقامات پر آئے ہیں۔جس کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔سورۂ النساء، چار مرتبہ: ۱-آیت نمبر۳، ۲-آیت نمبر۲۴، ۳-آیت نمبر۲۵، ۴-آیت نمبر۳۶۔

۲۔سورۂ النحل، ایک بار: ۱-آیت نمبر۷۱۔

۳۔سورۂ المومنون، بھی ایک بار: ۱-آیت نمبر۶۔

۴۔سورۂ النور، تین مرتبہ: ۱-آیت نمبر۳۱، ۲-آیت نمبر۳۳، ۳-آیت نمبر۵۸۔

۵۔سورۂ الروم، چار مرتبہ: ۱-آیت نمبر۲۸۔

۶۔سورۂ الاحزاب، چار مرتبہ: ۱-آیت نمبر۵۰، ۲-پھر آیت نمبر۵۰، ۳-آیت نمبر۵۲، ۴-آیت نمبر۵۵۔

۷۔اور سورۂ المعارج، ایک بار: ۱-آیت نمبر۳۰۔

---

* شعبہ علوم اسلامیہ، جامعہ کراچی۔

یہ بھی واضح رہے کہ بعض مقامات پر 'ماملکت ایمانکم' کے معنیٰ ہیں، وہ لوگ جو کسی کے ماتحت کام کریں، جو کسی کے تابع فرمان ہوں۔ دورِ نزولِ قرآن میں اس کی تفہیم لونڈی اور غلام دونوں سے ہوتی تھی، (مگر فی زمانہ اسے ایک حد تک ماتحت اور تابع فرمان لوگوں کے معنیٰ میں استعمال کیا جا سکتا ہے) اس مفہوم کے لیے درج ذیل مقامات دیکھے جا سکتے ہیں۔(۱) بعض مقامات پر یہ الفاظ صرف غلاموں کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ (۲) مگر اکثر و بیشتر یہ الفاظ صرف باندیوں کے لیے یا فقط معاہدۂ نکاح میں لانے کے مفہوم میں مخصوص ہیں۔ جس کا تعین سیاق عبارت اور نظم کلام سے بآسانی ہو جاتا ہے۔ اس مختصر سی تمہید کے بعد اب ہم وہ دلائل پیش کرنا چاہتے ہیں، جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ باندیوں کا جنسی استعمال بلکہ استحصال دورِ جاہلی کی یادگار ہے۔ اسلام نے اس ہوسنا کی اور جنسی انارکی کو اپنی انقلاب آفریں تعلیمات کے ذریعے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا ہے۔ اس سلسلۂ بیان میں ہمارے دلائل درج ذیل ہیں۔

پہلی دلیل:

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ج فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ۔(۳)

اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم یتیم (نابالغ بچوں اور بچیوں) کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو (اپنی پسندیدہ) ان عورتوں (یعنی بچوں کی ماؤں یا مختلف بالغ بچیوں) سے نکاح کر لو، جو خود بھی تمہارے نکاح میں آنا پسند کریں (۴) خواہ دو دو یا تین تین یا چار چار (مگر یاد رہے کہ یہ حکم، عدل کے ساتھ مشروط ہے) پھر اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم (دو یا دو سے زائد بیویوں میں) عدل نہ کر سکو گے تو صرف ایک ہی عورت سے (نکاح کرو) یا ان باندیوں سے (نکاح کر لو) جو تمہاری ملکیت میں ہیں۔ یہ حکم اس امر کے نزدیک تر ہے کہ تم ظلم نہ کر سکو۔

آیت مبارکہ میں ''ماملکت ایمانکم'' کے الفاظ یقینی طور پر کنیزوں اور باندیوں

کے لیے آئے ہیں۔قبل اس کے کہ دلیل میں کچھ معروضات پیش کیے جائیں، مناسب ہوگا کہ ''ایمانکم'' کی معنویت بھی واضح ہوجائے۔

ماملکت ایمانکم۔ایمان، یمین کی جمع ہے۔یمین اصل میں دائیں ہاتھ یا دائیں جانب کو کہتے ہیں جیسے قَالُوْٓا اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ (۵) (وہ کہیں گے۔بے شک تم ہی تو ہمارے پاس دائیں جانب سے (یعنی اپنے حق پر ہونے کی قسمیں کھاتے ہوئے) آیا کرتے تھے)۔اسی طرح آتا ہے۔**واصحب الیمین ما اصحب الیمین** (۶) (اور دائیں جانب والے اور کیا کہنے دائیں جانب والوں کے) واضح رہے کہ دائیں جانب سے کبھی حق کا مفہوم لیا جاتا ہے اور کبھی سعادت و برکت کا۔اس لیے کبھی یہ اپنے اصل معنی سے مجرد ہوکر فقط حق اور سعادت و برکت کے لیے بھی سمجھا جاتا ہے اور کبھی یہ قسم کے معنی میں بھی آتا ہے۔(۷) اس کے علاوہ یہ معاہدہ کے معنی میں بھی آتا ہے۔(۸) اس لیے عربی لغت میں مولی الیمین ایسے شخص کو کہا جاتا ہے، جس سے معاہدہ کیا گیا ہو۔(المفردات فی غریب القرآن) امام زجاجؒ نے **لاخذنا منہ بالیمین** (۹) (تو ہم ان کو اپنی قدرت سے پکڑ لیتے) میں یمین کے معنی قدرت کے کیے ہیں۔(۱۰) (۲) ایک حدیث میں الحجر الاسود کو ''یمین اللہ'' کہا گیا ہے۔یعنی اللہ کا ہاتھ۔کیوں کہ کسی شخص سے ملاقات اور تعلقات کی ابتدا ہاتھ ملا کر ہی کی جاتی ہے اور اس کے بعد ہی تعلقات کو بڑھایا جاتا ہے۔اسی طرح جب کسی سے عہد لیا جاتا ہے تو اس کا اظہار ہاتھ میں ہاتھ لے کر یا دے کر کیا جاتا ہے۔حجر اسود کو ہاتھ لگانے یا چومنے میں اس عہد کا اقرار مقصود ہوتا ہے، جو انسان اپنے رب سے کرنا چاہتا ہے۔یا اس سعادت و برکت کا حصول ہوتا ہے، جس کا وہ اپنے رب سے طلب گار رہے۔امام راغب اصفہانی (متوفی ۵۰۲ھ) کے نزدیک کسی چیز پر ملکیت اور قبضہ ظاہر کرنے کے لیے ''فی یدی'' کی نسبت ''ملک یمینی'' کا محاورہ زیادہ بلیغ ہے۔اسی بنا پر غلام اور کنیز کے لیے قرآن مجید نے ''**مما ملکت ایمانکم**'' کے محاورہ کو استعمال کیا ہے۔(۱۱) اس وضاحت کے بعد عرض ہے کہ......آیت مذکورہ بالا (النساء:۳) میں جہاں تعدد ازواج کا حکم مع ضرورت وحکمت کے بیان ہوا ہے۔وہیں قرآن کریم نے باندیوں اور کنیزوں کے جنسی استعمال سے بھی روکا ہے۔کیوں کہ **او ماملکت ایمانکم** کا عطف النساء پر ہے۔اور من کے

تعلق سے یہ دونوں فانکحوا سے مربوط ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح آزاد عورتوں سے نکاح کا حکم ہے۔ ویسے ہی باندیوں سے بھی نکاح کا حکم ہے۔ تمتع یا استمتاع کا نہیں۔

جن لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "او ماملکت ایمانکم" کا ذکر تعدد ازواج کی تحدید کو ختم کرنے کے لیے آیا ہے۔ یعنی بیویاں تو صرف چار تک ہوسکتی ہیں۔ البتہ باندیاں جتنی چاہیں رکھ سکتے ہیں۔ یہ بالکل غلط ہے۔ کیوں کہ اس استثناء کو قبول کرنے سے حکم کی غرض وغایت ہی باطل ہوجاتی ہے۔ اس خیال کی تغلیط میں مزید عرض ہے کہ او ماملکت ایمانکم میں او کا ربط، النساء کے ساتھ ہے۔ یعنی ترکیب عبارت یوں ہے۔ فانکحوا ماطاب لکم من النساء او من ماملکت ایمانکم۔ یعنی اپنی پسندیدہ عورتوں سے نکاح کرو، جو تمہیں بھی پسند کریں، خواہ عورتوں سے، خواہ باندیوں سے۔ اس ترکیب کی رو سے باندیاں خود تعدد ازدواج کی منصوص حد میں منحصر ہیں۔ اور اگر "الا تعدلوا فواحدة" کے بعد یہ کوئی الگ ہی صورت ہے اور مراد یہ ہے اگر ایک بھی حرہ زوجیت کے لیے میسر نہ ہو تو باندی سے نکاح کرو۔ اور اس کی مؤید وہ آیت ہے، جس میں کہا گیا ہے:

وَمَنۡ لَّمۡ يَسۡتَطِعۡ مِنۡكُمۡ طَوۡلًا اَنۡ	اورتم میں سے جو کوئی (اتنی) استطاعت نہ رکھتا
يَّنۡكِحَ الۡمُحۡصَنٰتِ الۡمُؤۡمِنٰتِ فَمِنۡ مَّا	ہو کہ آزاد مسلمان عورتوں سے نکاح کر سکے تو ان
مَلَكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ مِّنۡ فَتَيٰتِكُمُ	مسلمان کنیزوں سے نکاح کر لینا چاہیے جو تمہاری
الۡمُؤۡمِنٰتِ ۔(۱۲)	ملکیت میں ہیں۔

تو زیادہ سے زیادہ اس کو واحدۃ کے ساتھ بایں صورت جمع کیا جاسکتا ہے۔ یعنی اگر عدل نہ کرسکو تو ایک بیوی کے ساتھ تین کی حد تک باندیوں کو جمع کر سکتے ہو۔ اس لیے یہ دونوں صورتیں درست ہیں۔

بعض لوگوں نے لونڈیوں کو عدل کی شرط سے آزاد کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ دو یا دو سے زائد آزاد عورتوں میں عدل کی شرط کے ساتھ نکاح کا حکم ہے۔ یعنی اگر عدل نہ کرسکو تو ایک ہی پر اکتفا کرو۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ "فواحدۃ" بھی عدل کی شرط سے نکلی ہوئی ہے۔ حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔ پس جب تنہا ایک بیوی بھی عدل کی مستحق ہے تو ایک باندی یا متعدد باندیوں کو عدل کی

شرط سے کیسے خارج کیا جا سکتا ہے؟ میرے خیال میں باندیوں کو عدل سے مستثنیٰ اس وجہ سے سمجھا گیا کہ عہد جاہلی میں ان کے حقوق نصف سمجھے جاتے تھے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اسلام نے عہد جاہلی کی اس تفریق کو تسلیم کب کیا؟ کیا باندیوں کے نصف حقوق کا مسئلہ قرآن کریم میں بیان ہوا ہے؟ ہرگز نہیں۔ البتہ ایک مقام پر منکوحہ باندیوں کی بدکاری کی سزا ضرور اس طرح بیان ہوئی ہے کہ انہیں آزاد منکوحہ عورت کی سزا کی نصف سزا دی جائے۔ (۱۳) اور پھر حقوق کا مسئلہ بھی شاید وہیں سے مستنبط ہو گیا۔ آپ اس مسئلہ کو فقہاء کی زبان میں آزاد عورتوں کی ''نصف گواہی'' کی مثال سے سمجھ سکتے ہیں۔ ''نصف گواہی'' کا معاملہ تو واقعی حقوق کا معاملہ ہے۔ مگر اس کے باوجود آزاد عورتوں کے حقوق، مردوں کے حقوق کے مقابلے میں آدھے تسلیم نہیں کیے جاتے۔ اور یہاں تو تنصیف سزا میں ہے نہ کہ حقوق میں۔ پھر حقوق میں تنصیف کہاں سے آ گئی؟ تنصیف حقوق میں نہیں، سزاؤں میں ہے۔ کیوں کہ محل استنباط اسی کا متقاضی ہے۔

فقہ میں چوں کہ باندیوں کو اسی طرح سمجھا گیا ہے۔ اس لیے فقہ کے اثر سے قرآن کریم کی تفسیروں میں بھی یہ فکر مستعار در آئی۔ جیسا کہ مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے لکھا ہے:

> ''ما ملکت ایمانکم'' سے مراد لونڈیاں ہیں۔ چوں کہ ان کے معاملے میں عدل وغیرہ کی شرط نہیں ہے۔ اس وجہ سے ان کو اجازت دی۔ (۱۴)

آگے چل کر اصلاحی صاحبؒ نے لکھا ہے:

> ''پہلی چیز تو یہ ہے کہ مسلمانوں کو یاد دلایا ہے کہ عزت و شرف کی بنیاد ایمان و اسلام پر ہے اور یہ چیز ایسی ہے کہ جس طرح ایک آزاد اس سے بہرہ ور ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ایک غلام بھی ہو سکتا ہے۔ رہا نسل و نسب کا معاملہ تو اس اعتبار سے آزاد و غلام بلکہ تمام انسان برابر ہیں۔ پھر یہ حقیر کیوں سمجھے جائیں؟ دوسری چیز یہ ہے کہ لونڈیوں کے لیے بھی مہر اور احصان کی وہی شرطیں مقرر ہوئیں۔ جو آزاد عورتوں کے لیے تھیں تا کہ سوسائٹی کے اندر ان کا معیار اونچا ہو ......دوسرے مالکوں کی لونڈیوں کے ساتھ مسلمانوں کو نکاح کی اجازت دی گئی اور اس سے بھی مقصود لونڈیوں کے معاشرتی معیار کو اونچا کرنا تھا''۔ (۱۵)

اصلاحی صاحبؒ نے اول الذکر اقتباس میں جولکھا ہے، اسے ایک دفعہ پھر دیکھ لیجیے۔اور مؤخرالذکر اقتباس کو بھی دیکھ لیجیے۔ بڑے ادب واحترام سے عرض کروں گا۔کیا اس مسئلہ میں وہ خلط مبحث کا شکار نہیں لگتے ؟یعنی پہلے تو انہوں نے لونڈیوں کے حق میں عدل وغیرہ کی شرط کوتسلیم نہیں کیا۔مگر آگے چل کرتسلیم کرلیا کہ لونڈیوں کے لیے بھی مہر اوراحصان کی وہی شرطیں مقرر ہوئی ہیں ، جوآزادعورتوں کے لیے تھیں ۔اس اعترافی بیان کے بعد ظاہر نہیں ہو پا رہا کہ ان کے نزدیک عدل سے کیا مراد ہے؟ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم میں منکوحات کے حقوق (قطع نظر اس کے کہ وہ منکوحہ،آزاد ہو یا باندی) مطلقاً بیان کردیے گئے ہیں ۔جن میں مہر اور نان ونفقہ کے ساتھ ساتھ، انہیں ضرر اور تعدی اور ایلاء سے روکا گیا ہے ۔پس ان احکام کی بجا آوری کو عدل ہی کہتے ہیں۔

علامہ غلام رسول سعیدی صاحب نے **فَـاِنْ خِـفْتُـمْ اَلَّا تَـعْـدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْمَـا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ** کا ترجمہ اس طرح کیا ہے:

> ’’پس اگر تمہیں یہ خدشہ ہو کہ تم (ان میں) عدل نہ کرسکو گے تو
> (صرف) ایک سے نکاح کرویا اپنی مملوکہ کنیزوں سے استمتاع کرو‘‘۔(۱۶)

سعیدی صاحب نے استمتاع کا لفظ کیوں اختیار کیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ لفظ محل نظر ہے ۔انہوں نے اسے نکاح کے مقابلے میں استعمال کیا ہے، جب کہ آیت میں فانکحوا کا لفظ آیا ہے ۔اس لیے اصلاً تو یہ چاہیے تھا کہ جس طرح انہوں نے آزادعورتوں کے لیے’’نکاح‘‘ کا لفظ استعمال کیا ہے ۔اسی طرح مملوکہ کے لیے بھی اختیار کرتے ،مگر مروج فقہ کے اثر میں وہ ایسا نہ کرسکے، بلکہ انہوں نے تو کنیزوں کو نکاح کے بغیر ہی استعمال کرنے کو’’قرآنی حکم‘‘ کے طور پر ظاہر کردیا۔انہوں نے یہ جملہ تفسیری حاشیے میں نہیں، بلکہ اپنے ترجمے میں شامل کیا ہے۔اورکون نہیں جانتا کہ لفظ استمتاع متعہ کے مترادف کے طور پر برصغیر پاک وہند کے لوگوں میں عام رائج ہے۔ جس سے یہ تاثر ابھر سکتا ہے کہ سعیدی صاحب باندیوں سے متعہ کے قائل ہیں۔حالاں کہ اصلاً ایسا نہیں ہے ۔مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ باندیوں سے استمتاع ہو یا عام عورتوں سے متعہ۔ یہ دونوں صورتیں ایک ہی حکم میں آتی ہیں ۔ جسے سفاح کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔اور جوقرآن کریم

کے تصور احسان کے خلاف ہے۔(۱۷)

علامہ سعیدی نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

''باندیوں کے ساتھ ان کے مالک، بغیر نکاح کے مباشرت کر سکتے ہیں''۔

اور یہ کہ:

''اسلام نے لازمی طور پر یہ نہیں کہا کہ جنگی قیدیوں کو لونڈیاں اور غلام بنایا جائے، بلکہ اسلام نے یہ حکم دیا ہے کہ ان کو بلا فدیہ آزاد کر دیا جائے یا جسمانی فدیہ کے بدلے میں آزاد کر دیا جائے یا ان کو لونڈی اور غلام بنالیا جائے''۔(۱۸)

سعیدی صاحب نے اول الذکر اقتباس میں بغیر نکاح، مباشرت کا مسئلہ یقیناً رائے عامہ کی نمائندگی میں لکھا ہے۔ کیوں کہ یہ حکم پورے قرآن کریم میں کہیں نہیں آیا۔ ہاں یہ ضرور آیا ہے کہ بغیر نکاح، مباشرت کرنا بجز فعل زنا کے کچھ نہیں۔ حیرت ہے کہ متعہ کو حرام قرار دینے والے اس طرح کے استمتاع یعنی جبری مباشرت کو کس طرح عین اسلامی قرار دیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ جنگی قیدیوں کا مسئلہ سورۂ محمد کی آیت نمبر ۴ میں آچکا ہے۔ وہاں صرف دو ہی اختیار دیے گئے ہیں۔ تیسرا نہیں ہے۔ پس جنگی قیدیوں کو لونڈی اور غلام بنانے کا حکم مخالف قرآن حکم ہے۔ ایسے حکم کو اسلامی حکم قرار دینا صحیح نہیں ہے۔

اس ضمن میں سورۂ محمد کی آیت ملاحظہ ہو:

فَاِمَّا مَنًّۢا بَعۡدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الۡحَرۡبُ اَوۡزَارَهَا ۔(۱۹)	پھر انہیں فدیہ لیئے بغیر چھوڑ دو یا فدیہ لے کر چھوڑ دو۔ یہاں تک کہ جنگ اپنے اختتام کو پہنچ جائے۔

جب جنگی قیدیوں کے لیے سوائے دو اختیاروں کے تیسرا موجود ہی نہیں ہے تو جنگ میں ہاتھ لگی قیدی عورتیں اس حکم سے مستثنیٰ کیسے ہو سکتی ہیں؟ کہ انہیں رہا نہ کیا جائے۔ اس واضح حکم کے بعد بھی اگر کوئی قیدی عورتوں کو ملک یمین سمجھنے پر مصر ہے اور اسی بنیاد پر ان سے جبری مباشرت کو جائز سمجھتا ہے تو یہ قرآن کریم کی صاف خلاف ورزی ہے۔ کیوں کہ ایسی مقید اور مجبور عورتوں سے تمتع کرنا، اسلام تو درکنار دنیا کے کسی بھی اخلاقی قانون میں اس کی گنجائش نہیں نکل سکتی۔ اسی لیے محترم اصلاحی صاحبؒ کی یہ بات ہمارے ناقص فہم سے بالا ہے، جس میں وہ فرماتے

ہیں۔ ''کوئی عورت بیک وقت دو مردوں کی زوجیت میں نہیں ہوسکتی۔ صرف ملک یمین اس سے مستثنیٰ ہے۔ اس کا کسی کی ملکیت میں آجانا ہی اس کے سابق نکاح کو جو دارالحرب میں ہوا، کالعدم قرار دے دیتا ہے''۔ (۲۰) اصلاحی صاحب کی یہ تفسیر اس روایت کا حصہ ہے، جسے بالعموم ہمارے مذہبی کلچر میں جائز اور روا سمجھا گیا ہے۔ یعنی ''عورت کا کسی کی ملکیت میں آجانا، سابق نکاح کو کالعدم قرار دے دیتا ہے''۔ یہ جملہ نہ صرف وضاحت طلب ہے، بلکہ دلیل طلب بھی ہے۔ ہمارے نزدیک محض ''عارضی قید'' کسی کے سابقہ نکاح کو ختم نہیں کرسکتی۔ ''عارضی قید'' کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ اسلام نے نہ تو مستقل غلامی کو رواج دیا ہے اور نہ جنگی غلامی کو۔ اس لیے اسلام کی رو سے کسی کو ''غلام اور باندی'' بنا کر مستقل بنیادوں پر نہیں رکھا جاسکتا۔ قرآن کریم کے مطابق جنگی قیدیوں کو ہر حال میں رہا کرنا ہے۔ خواہ فدیہ لے کر، خواہ فدیہ کے بغیر۔ جب مملوک کے ساتھ یہ حکم ہے تو مملوکہ کو اس حکم سے کیسے نکالا جاسکتا ہے؟

اس لیے جنگی قید میں آنے والی عورتوں کے ساتھ ایسا تصور کہ قید ہونے کے سبب ان کا سابقہ نکاح کالعدم ہوگیا ہے۔ نہ صرف خود ان عورتوں کے ساتھ زیادتی ہے، بلکہ ان کے شوہروں اور بچوں (اگر ہوں) کے ساتھ بھی بڑی زیادتی ہے۔ بیک جنبش قلم عورتوں کو ان کی نفسیاتی حیات سے منقطع کردینا اسلامی طرز عمل کیسے ہوسکتا ہے؟ اس لیے محترم اصلاحی صاحبؒ کی بات بلا دلیل ہونے کی وجہ سے قابل اعتناء نہیں ہے۔

اب ذیل میں مولانا ابوالکلام آزادؒ کا ترجمہ دیکھئے:

> ''یا پھر جو عورتیں (لڑائی کے قیدیوں میں سے) تمہارے ہاتھ آگئی ہیں (انہیں بیوی بنا کر رکھو)''۔ (۲۱)

ہمیں اس ترجمہ کی صدائے بازگشت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے ہاں بھی سنائی دیتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ان کے ساتھ عدل نہ کرسکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کرو یا ان عورتوں کو زوجیت میں لاؤ، جو تمہارے قبضے میں آئی ہیں۔ بے انصافی سے بچنے کے لیے یہ زیادہ قرین صواب ہے''۔ (۲۲)

اور حاشیے میں لکھتے ہیں:

''لونڈیاں مراد ہیں۔یعنی وہ عورتیں جو جنگ میں گرفتار ہوکر آئیں اور حکومت کی طرف سے لوگوں میں تقسیم کردی جائیں۔مطلب یہ کہ اگر ایک آزاد خاندانی بیوی کا بار بھی برداشت نہ کرسکو تو پھر لونڈی سے نکاح کرو''۔(۲۳)

ہمارے نزدیک ان دونوں بزرگوں نے بھی ''جنگی قیدیوں'' کے تناظر میں ہی ان عورتوں سے نکاح کرنے کا ذکر کیا ہے گو ملک یمین سے نکاح کرنے کے حکم کی حد تک تو ان کا ترجمہ درست ہے۔مگر معلوم رہے کہ یہ ''حکم'' اسیر عورتوں سے نہیں، بلکہ وراثت میں مدتوں سے چلی آئی باندیوں اور کنیزوں سے نکاح کرنے کا ہے، جسے غلطی سے اسیر عورتوں پر محمول کرلیا گیا ہے۔

مولانا محمود حسنؒ (اسیر مالٹا) نے اپنے ترجمہ میں لکھا ہے:

''......تو ایک ہی نکاح کرو، یا لونڈی، جو اپنا مال ہے''۔(۲۴)

اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے جن الفاظ میں اس کا حاشیہ لکھا ہے۔وہ یہ ہے:

''یعنی اگر تم کو اس کا ڈر ہو کہ کئی عورتوں میں انصاف اور مساوات کے مطابق معاملہ نہ کرسکو گے تو پھر ایک ہی نکاح پر قناعت کرو یا صرف لونڈیوں پر ایک ہو یا زیادہ بس کرو یا چاہو تو ایک منکوحہ کے ساتھ یا چند لونڈیوں کو جمع کرلو''۔(۲۵)

مولانا محمود حسنؒ نے اپنے ترجمہ میں لونڈیوں کو مال لکھا ہے، جو ہمارے نزدیک شرفِ انسانیت سے گرا ہوا لفظ ہے۔کیوں کہ لونڈی انسان ہے۔مال نہیں ہے۔جیسا کہ قرآن مجید نے بتایا ہے۔

بَعۡضُكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ ۔(۲۶) تم باہم ایک دوسرے کی جنس سے ہو۔

اس لفظ (مال) سے مالکوں کا اپنی لونڈیوں پر ایسا تصرف ظاہر کیا گیا ہے۔جیسا کہ عہد جاہلی میں بالفعل کیا جاتا تھا۔پھر حاشیہ میں منکوحہ کے ساتھ۔ایک یا چند لونڈیوں کو جمع کرنے کا مسئلہ بھی لکھا گیا ہے۔جب کہ قرآن مجید میں منکوحہ کے ساتھ لونڈی کو بطور لونڈی کے جمع کرنے کا مسئلہ بیان نہیں ہوا ہے۔بلکہ آیت میں ناانصافی سے بچنے کے لیے بجائے چار، تین اور دو بیویاں رکھنے کے صرف ایک بیوی پر انحصار کرنے کو کہا گیا ہے۔پھر **ماملکت ایمانکم** سے

پہلے او کا جو لفظ آیا ہے۔ از روئے سیاق عبارت اس کا مطلب اس جگہ اب ''ساتھ'' نہیں ہوسکتا بلکہ بمعنی تقسیم ''یا'' ہی ہوسکتا ہے۔ (۲۷) یعنی اگر ایک بیوی بھی نہ رکھ سکو تو کسی ایک باندی سے نکاح کرلو نہ کہ متعدد باندیوں کو بطور باندیوں کے جمع کرلو۔

واضح رہے کہ آیت کی رو سے باندی کے ساتھ بھی نکاح کا حکم ہے۔ بغیر نکاح جنسی تعلق قائم رکھنے کا حکم نہیں ہے۔ اور منکوحات کی تعداد پہلے ہی چوں کہ چار کی حد تک محدود کردی گئی ہے۔ اس لیے از روئے قیاس بھی باندیاں چار سے زیادہ نہیں ہوسکتیں۔ مگر حاشیہ جس اسلوب پر معرض تحریر میں آیا ہے۔ اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ محشی کے نزدیک باندیوں کی تعداد پر کوئی قدغن نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اسلوب عبارت قرآن کریم کے تصور عدل کے ہی خلاف ہے۔ اس خلاف عدل تصور کی صدائے بازگشت، مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے ہاں بھی ملاحظہ کیجیے:

> ''جس طرح شریعت نے بیویوں کی تعداد پر چار کی پابندی لگائی ہے۔ اس طرح لونڈیوں کی تعداد پر نہیں لگائی لیکن اس معاملے میں کوئی حد مقرر نہ کرنے سے شریعت کا منشا یہ نہیں تھا کہ مالدار لوگ بے شمار لونڈیاں خرید خرید کر جمع کرلیں اور اپنے گھر کو عیاشی کا گھر بنالیں، بلکہ درحقیقت اس معاملے میں عدم تعین کی وجہ جنگی حالات کا عدم تعین ہے''۔ (۲۸)

غور فرمائیے! منکوحات کی تعداد تو چار کے عدد سے معدود ہو، مگر باندیاں اس تعین سے مستثنٰی ہوں۔ یہ بات کچھ عجیب سی لگتی ہے۔ بلکہ تعین تعداد کے مقصد اور اس کے نتائج و مضمرات کو بے اثر کردینے کے مترادف بھی لگتی ہے۔ پھر بے حد و شمار لونڈیاں رکھنے کی اجازت دینے کے ساتھ معاشرے کے امراء و روساء پر کثیر تعداد میں اس ''ثواب'' کے حصول پر تنقید کیسی؟

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ ای!
بازمی گوید کہ دامن تر مکن ہشیار باش

قرآن کریم نے چار تین اور دو ازواج کے ساتھ عدم استطاعت عدل کی وجہ سے فقط ایک بیوی پر انحصار کرنے کا حکم دیا ہے اور جو لوگ کسی ایک حرہ کو بھی صحیح طور پر نبھا نہ سکیں تو وقتی اور عارضی معاشرتی تفاوت کے سبب انہیں ''ماملکت ایمانکم'' سے نکاح کرنے کا حکم دیا ہے۔ یہ حکم

جس اسلوب میں آیا ہے۔ وہ اسلوب بجائے خود اس امر کا غماز ہے کہ ''منکوحہ'' خواہ آزاد عورت ہو یا مملوکہ۔ ان کی مجموعی تعداد ''چار'' سے زیادہ نہیں ہوسکتی۔

دوسری دلیل:

وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ۔(۲۹)

اور وہ عورتیں (تم پر حرام ہیں) جو دوسرے شوہروں کے نکاح میں ہیں۔ البتہ جو کنیزیں تمہاری ملکیت میں ہوں (وہ بذریعۂ نکاح تمہارے لیے جائز ہوں گی) اللہ نے (ان احکامِ حرمت کو) تم پر فرض کردیا ہے اور ان محرمات کے سوا، تمہارے لیے دیگر عورتوں کو حلال کردیا ہے (۳۰) تاکہ تم اپنے اموال کے ذریعے نکاح کرنے والے بنو۔ پاکیزہ کردار کے حامل ہوتے ہوئے نہ کہ شہوت رانی کرنے والے بنتے ہوئے۔

ماملکت ایمانکم سے اگر بغیر نکاح کے تمتع کا حصول جائز ہوتا تو ''**محصنین غیر مسٰفحین**'' کے الفاظ نہ لائے جاتے۔ احصان اور سفاح کے درمیان فرق صرف نکاح ہی کا ہے۔ اگر یہ فرق ختم کردیا جائے تو محرمات کے سوا، ہر عورت بغیر نکاح کے حلال سمجھی جاسکتی ہے۔ البتہ ماملکت ایمانکم (باندیوں) اور **ماوراء ذلکم** (آزاد لیکن غیر محرم خواتین) کے درمیان اصلاً فرق سوشل اسٹیٹس کا ہے۔ جہاں تک عزت و عصمت اور ناموس و عفت کا تعلق ہے تو اس میں دونوں برابر ہیں۔ یعنی باندی ہونا اس امر کو مستلزم نہیں کہ عہد جاہلی کی طرح اسے محل سفاحت سمجھا جائے۔ اسی لیے اسلام نے باندیوں کو محل سفاحت سے نکال کر قلعۂ احصان میں داخل ہونے یا کرنے کے احکام دیے۔ ہمارا ماننا ہے کہ جب کسی حرہ سے بغیر نکاح کے صحبت و مجامعت جائز نہیں ہے تو باندی سے کیسے جائز ہوسکتی ہے؟ اور بہ فرض محال اگر بر بنائے ملکیت یہ صحبت جائز ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان سے نکاح کرنے کا حکم کیوں دیا؟ کیا یہ حکم خود نہیں بتاتا کہ باندیوں سے تمتع، نکاح کے بغیر منع ہوگیا تھا۔

اس آیت میں ماملکت ایمانکم سے مقصود بجائے باندیوں کے، ملک نکاح یا معاہدۂ نکاح بھی ہوسکتا ہے۔اور یہ مراد نہ صرف مفسرین نے لی ہے بلکہ لغت بھی اس پر شاہد ہے۔ کیوں کہ یمین کے معنی معاہدے کے بھی آتے ہیں اور نکاح ایک معاہدہ ہی ہے۔مولانا عبدالکریم اثری نے اپنی تفسیر میں اس آیت پر ایک جامع نوٹ لکھا ہے۔جسے آپ کے ملاحظے کے لیے پیش کرتا ہوں۔

اس آیت کی تفسیر چار طریقوں سے کی گئی ہے اور چاروں ہی طریقوں سے صحیح اور درست ہے۔

اول: محصنات سے شادی شدہ عورتیں مراد لی گئی ہیں۔جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ اس طرح اس کی دوصورتیں ہیں۔پہلی یہ کہ اوماملکت ایمانکم سے مراد وہ عورتیں لی جائیں۔جو جنگ میں قید ہوکر ملک یمین ہوجاتی ہیں اور اس طرح معنی آیت کے اس طرح ہوں گے، خاوند والی عورتوں سے نکاح کرنا منع ہے۔سوائے ان خاوند والی عورتوں کے جو ملک یمین میں آجائیں اور دوسری صورت یہ کہ ملک یمین سے مراد ملک نکاح لی جائے تو اس طرح آیت کے معنی یہ ہوں گے۔خاوند والی عورتیں تم پر حرام ہیں۔سوائے اس صورت کے کہ وہ تمہاری ملک میں آجائیں بعد اس کے کہ ان کے پہلے خاوندوں سے جدائی واقع ہوجائے۔کیوں کہ جب تک پہلے خاوند سے جدائی نہ ہوجائے۔ایسی عورت ملکِ نکاح میں نہیں آسکتی۔

دوم: محصنات سے مراد آزاد عورتیں لی جائیں (۳۱) تو اس طرح بھی دو ہی صورتیں ہوں گی۔پہلی یہ کہ ماملکت ایمانکم سے مراد وہ عدد لیا جائے۔جو اللہ نے بیک وقت نکاح میں لانے کی حد مقرر کردی ہے یعنی چار اور دوسری یہ کہ ماملکت ایمانکم سے مراد یہ لی جائے کہ وہ عورتیں، جو تمہارے قبضے میں جائز طور پر آچکی ہیں یعنی دل کی رضامندی سے اور گواہوں کی موجودگی میں اور دوسری شرائط کے ساتھ تو اس طرح دونوں صورتوں میں معنی یہ ہوں گے۔ آزاد عورتیں چار کی تعداد سے زیادہ تمہارے لیے حرام ہیں یا یہ کہ آزاد عورتیں تمہارے لیے حرام ہیں سوائے اس کے کہ جائز طور پر وہ تمہارے نکاح میں آئیں۔

اس طرح پہلے اقتباس کی دوصورتوں میں سے دوسری صورت اور دوسرے اقتباس کی

دونوں صورتوں کو ملا کر تینوں صورتوں میں جو معنی کیے گئے ہیں۔ ان پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوسکتا اور پہلی صورت پر ذرا غور کرنا اور ذہن پر زور ڈالنا پڑتا ہے اور اس طرح بات بالکل واضح ہوجاتی ہے۔ اس طرح تمام منکوحہ عورتوں سے نکاح حرام قرار پاتا ہے۔ خواہ وہ کسی مذہب وملت سے تعلق رکھتی ہوں اور اس طرح گویا دوسرے مذاہب کی عورتوں کے نکاح کو بھی صحیح تسلیم کیا گیا اور حکم دیا کہ ''کسی مذہب یا قوم کی عورت سے جو نکاح شدہ ہو، مسلمان کا نکاح کرنا ناجائز ہے۔ سوائے اسی منکوحہ عورت کے جو ملک یمین ہوجائے''۔ یعنی شادی شدہ عورت جب کسی کی ملک یمین ہوجائے تو اس صورت میں اس سے نکاح کرلینا جائز ہے۔ اس میں سمجھایا جارہا ہے کہ نکاح کے بغیر کسی قسم کا تعلق مرد وعورت کا ہونا ہرگز ہرگز جائز نہیں۔ ہاں اس آیت میں ملک یمین یعنی لونڈی سے نکاح کرلینے کی اجازت کا حکم دیا جارہا ہے اور وہ نکاح دوسری شرائط کے ماتحت ہے۔ جن میں سے بعض شرائط کا ذکر آگے والی آیت میں دیا جارہا ہے اور عام شرائط قرآن کریم کی دوسری آیات میں موجود ہیں مثلاً یہ کہ مشرکہ عورت سے نکاح جائز نہیں ہے۔ اور یہ بات جو لوگوں میں معروف ہے اور علمائے مفسرین کی خاصی تعداد اسی طرف چلی گئی ہے کہ ''ملک یمین'' کے ساتھ نکاح کی ضرورت نہیں، بالکل لغو ہے۔ (۳۲)

اثری صاحب نے آیت کی تفسیر میں چار طریقوں کو نقل کیا ہے اور تفسیر کی چاروں ہی صورتوں کو درست قرار دیا ہے۔ ہمارے نزدیک ان کی بیان کردہ چار صورتوں میں سے مؤخر الذکر تین صورتیں تو کسی نہ کسی پہلو سے درست ہوسکتی ہیں البتہ پہلی صورت جزواً صحیح نہیں ہے۔ یہ وہی صورت ہے، جسے انہوں نے غور کرنے اور ذہن پر زور ڈالنے کی شرط کے ساتھ لکھا ہے۔ وہ صورت ایک بار پھر ملاحظہ فرمائیں۔

پہلی یہ کہ او ماملکت ایمانکم سے مراد وہ عورتیں لی جائیں، جو جنگ میں قید ہوکر ملک یمین ہوجاتی ہیں اور اس طرح معنی آیت کے اس طرح ہوں گے، خاوند والی عورتوں سے نکاح کرنا منع ہے۔ سوائے ان خاوند والی عورتوں کے، جو ملک یمین میں آجائیں۔

ہم اس سے قبل ''پہلی دلیل'' میں واضح کرچکے ہیں کہ جنگ میں قید ہوکر آنے والے مردوں اور عورتوں کو سورۂ محمد: ۴ کے مطابق ہر حالت میں رہا کرنے کا حکم موجود ہے۔ اس لیے

قیدی مردوں کو غلام اور قیدی عورتوں کو کنیز بنا کر رکھنا اس آیت کی کھلم کھلا خلاف ورزی ہے۔ اور خلاف قرآن ہونے کے سبب یہ بات کسی بھی صورت قبول نہیں ہوسکتی۔

ہمارا اصولی موقف یہ ہے کہ ملک یمین سے جنگی قیدی عورتوں کو مراد لینا کسی طور بھی درست نہیں ہوسکتا۔ بلکہ اس سے وہ عورتیں مراد ہیں، جنہیں قبل از اسلام غلامی وراثت میں ملی تھی اور وہ جدی پشتی غلام چلی آرہی تھیں۔ قرآن مجید نے اس لیے ایسے لوگوں کو صیغۂ ماضی کے اسلوب میں بیان کیا ہے۔ یعنی **ما ملکت ایمانکم** نہ کہ مضارع کے اسلوب میں۔ اگر جنگی قیدیوں کو غلام اور کنیز بنا کر رکھنا جائز ہوتا تو اسے صیغۂ مضارع میں بیان کیا جاتا۔ کیوں کہ جنگی سلسلہ کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ اور جس طرح جنگ کا امکان، ہمیشہ باقی رہتا۔ اسی طرح غلام اور کنیزوں کا امکان بھی جنگی امکان سے وابستہ ہونے کے سبب ممکنہ طور پر قائم رہنے والا مسئلہ بن جاتا اور یوں غلامی کا یکسر خاتمہ کبھی ممکن نہ ہوتا۔ قرآن کریم نے **ما ملکت ایمانکم** کے اسلوب میں موروثی غلامی کو ختم کرنے کا اعلان کیا ہے۔ نہ کہ آیندہ غلامی کو جاری رکھنے کا۔ بدقسمتی سے اس مسئلہ کو اکثر جنگی تناظر میں دیکھا گیا ہے۔ اسی لیے باندیوں کا تصور ذہنوں سے محو نہ ہوسکا اور یہ تصور قرآن کریم کے تراجم وتفاسیر میں بھی در آیا۔ مثلاً سید مودودیؒ کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

> ''اور وہ عورتیں بھی تم پر حرام ہیں، جو کسی دوسرے کے نکاح میں ہوں (محصنات) البتہ ایسی عورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں، جو (جنگ میں) تمہارے ہاتھ آئیں''۔ (۳۳)

اور ڈاکٹر محمد طاہر القادری کا ترجمہ یہ ہے:

> ''اور شوہر والی عورتیں (بھی تم پر حرام ہیں) سوائے ان (کافروں کی قیدی عورتوں) کے جو تمہاری ملک میں آجائیں'' (۳۴)

ان دونوں تراجم پر بلکہ ان جیسے دیگر تمام تراجم پر ہمارا نقد یہ بھی ہے کہ **ما ملکت ایمانکم** کا ترجمہ مستقبل کے صیغے سے کیا گیا ہے۔ جو کہ صحیح نہیں ہے۔ صحیح اس لیے نہیں ہے کہ اس طرح کے تراجم سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم غلامی کے ادارے کو ختم کرنا نہیں چاہتا بلکہ قائم اور باقی رکھنا چاہتا ہے۔ جب کہ یہ تاثر خلاف حقیقت ہے۔ قرآنی الفاظ اس طرح کے

کسی مفہوم سے اِبا کرتے ہیں، جسے تراجم میں ظاہر کیا گیا ہے۔ اور جنگ میں ہاتھ آئی قیدی عورتوں کو باندی بنانے پر ہمارا انقاد اس سے پہلے آ چکا۔ جسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔

تیسری دلیل:

وَمَنۡ لَّمۡ يَسۡتَطِعۡ مِنۡكُمۡ طَوۡلًا اَنۡ يَّنۡكِحَ الۡمُحۡصَنٰتِ الۡمُؤۡمِنٰتِ فَمِنۡ مَّا مَلَـكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ مِّنۡ فَتَيٰتِكُمُ الۡمُؤۡمِنٰتِ وَاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِاِيۡمَانِكُمۡ بَعۡضُكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ فَانْكِحُوۡهُنَّ بِاِذۡنِ اَهۡلِهِنَّ وَاٰتُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ مُحۡصَنٰتٍ غَيۡرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخۡدَانٍ فَاِذَاۤ اُحۡصِنَّ فَاِنۡ اَتَيۡنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيۡهِنَّ نِصۡفُ مَا عَلَى الۡمُحۡصَنٰتِ مِنَ الۡعَذَابِ ۔(۳۵)

اور تم میں سے جو لوگ اتنی استطاعت نہ رکھتے ہوں کہ آزاد مسلمان عورتوں سے نکاح کر سکیں تو انہیں ان مسلمان کنیزوں سے نکاح کر لینے چاہئیں جو (حسبِ دستور) تمہارے زیر اختیار ہیں۔ اور اللہ تمہارے ایمان کو خوب جانتا ہے۔ تم سب (کیا غلام کیا آقا؟) ایک دوسرے کی جنس میں سے ہو۔ چنانچہ ان (باندیوں) سے ان کے مالکوں کی اجازت سے نکاح کرو۔ اور انہیں ان کے مہر حسب دستور ادا کرو۔ درآں حال یہ کہ وہ (عفت قائم رکھتے ہوئے) قید نکاح میں آنے والیاں ہوں نہ کہ بدکاری کرنے والیاں اور نہ در پردہ آشنائی کرنے والیاں۔ اور جب وہ نکاح کے بندھن میں بندھ جائیں پھر بدکاری کی مرتکب ہوں تو ان کے لیے اس سزا سے آدھی سزا ہے۔ جو (آزاد منکوحہ) عورتوں کے لیے مقرر کی گئی ہے۔

آیت کے ابتدائی فقرے میں ہی ملک یمین سے نکاح کرنے کا حکم ملتا ہے۔ یعنی اگر کوئی آزاد عورت سے نکاح کی سکت نہیں رکھتا تو اسے باندی سے نکاح کر لینا چاہیے۔ اس ابتدائی فقرے کی وضاحت اگلے فقرے میں آ گئی ہے کہ تم باندیوں سے نکاح ضرور کرو مگر ان کے مالکوں کی اجازت سے اور انہیں ان کے مہر بھی دو۔

اس حکم سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک یمین سے تعلق جنسی، بغیر نکاح کے قائم کرنا ناجائز

وممنوع باور کرایا گیا تھا۔ اگر نکاح کے بغیر جنسی مقاربت جائز ہوتی تو حکم نکاح کیوں ہوتا؟ پھر نکاح کا ایک مقصد جنسی آسودگی کے علاوہ نسل انسانی کی افزائش بھی ہوتا ہے۔ جسے نسبی تحفظ دینا معاشرہ کی قانونی ضرورت ہے۔یعنی ایسی ضرورت کہ جس سے معاشرتی واخلاقی پیچیدگیوں سے بچا جائے۔ اس لیے اگر کوئی باندی نکاح بھی کرے اور اپنے مالک کے زیر استعمال بھی رہے تو نسب کے عدم تحفظ یا غیر یقینی ہونے کے سبب اس کے نکاح کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ اس لیے عقلاً بھی ماننا پڑتا ہے کہ معاشرتی واخلاقی طور پر مالک اور مملوکہ میں تعلق زن وشو محض بر بنائے ملکیت جائز نہیں ہوسکتا۔

دوسرے یہ مسئلہ صرف باندی کے لیے خاص کیوں؟ اور اس اصول پر مالکہ کا اپنے غلام کے ساتھ ہم بستر ہونا ناجائز کیوں؟ اس پر غور کیجیے، کیوں کہ غور کرنے سے ہی پتا چلے گا کہ مباشرت کی علت ملکیت محض نہیں ہوسکتی۔ جیسا کہ سمجھا جاتا ہے، کیوں کہ مالکہ کے لیے یہ حق تسلیم نہیں کیا گیا۔

آیت مذکورہ بالا (النساء:۲۵) کی تفسیر کرتے ہوئے علامہ غلام رسول سعیدی نے لکھا ہے:

> ''باندی پر اس کے مالک کا حق شوہر کے حق سے زیادہ ہوتا ہے۔ اس لیے وہ تمہاری خدمت اور حقوق کی سبیل نہیں پاسکیں گی اور ان کے مالک سفر اور حضر میں ان سے خدمت لینے اور جس کو چاہے فروخت کرنے پر قادر ہوں گے اور اس میں شوہروں کے لیے دشواری ہے۔ کیوں کہ باندی کے مہر کا مالک اس کا مولیٰ ہوگا۔ اور اس باندی سے جو اولاد پیدا ہوگی، وہ اس کے مالک کی غلام ہوگی''۔(۳۶)

سعیدی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے۔ وہ رواجی قانون کے مطابق یقیناً درست ہوگا۔ لیکن شرعی اعتبار سے وہ سب بلا دلیل ہے۔ ان کے دعووں میں سے کوئی ایک دعویٰ بھی ایسا نہیں، جو قرآن مجید سے ثابت ہو سکے۔ مثلاً ان کے مطابق:

۱۔ باندی پر اس کے مالک کا حق شوہر کے حق سے زیادہ ہونا۔ ۲۔ شادی شدہ باندی کو جب اور جس کو چاہنا فروخت کر دینا۔ ۳۔ باندیوں کے مہر کا حق دار، ان کے مالکوں کو قرار دینا۔

۴۔ باندی کی اولاد کا مالک کا غلام بن جانا۔ یہ سارے دعوے قرآنی تعلیمات اوراس کی روح کے یکسر منافی ہیں۔جنہیں سماجی مفروضات یا فقہی نظریات کے طور پر اختیار کرلیا گیا ہے۔اور سوائے رواج کے اس کی کوئی سند قرآن مجید میں نہیں ملتی۔

ذیل میں علامہ سعیدی کے دعوؤں کا جواب قرآن کریم کی روشنی میں ملاحظہ ہوں:

(۱۔۲) اسلام میں شوہر کا حق بیوی پر سب سے زیادہ مقدم ہوتا ہے۔ **وللرجال علیھن درجہ** (۳۷)(البتہ شوہروں کو اپنی بیویوں پر ایک درجہ فضیلت حاصل ہے)وہ شوہر خواہ غلام ہو یا آزاد۔ بلاشبہ شادی سے پہلے یہ حق فضیلت مالک کو اپنی باندی پر بر بنائے ملکیت حاصل ہوتا ہے۔مگر شادی کے بعد یہ حق ،شوہر کو مل جاتا ہے۔اگر نکاح کے بعد بھی باندی اپنے ''شوہر'' کی ''بیوی'' نہ بن سکے بلکہ غالب حیثیت میں اپنے مالک کی باندی رہے تو ایسا نکاح،کم ازکم ''قرآنی نکاح'' کہلانے کا مستحق نہیں ہوسکتا۔ پھر شادی کے بعد بیوی اپنے شوہر کی حمیت و غیرت بھی ہوتی ہے،اس لیے بھی یہ بات ناقابل تصور ہے کہ باندی پر اس کے مالک کا حق شوہر کے حق سے زیادہ ہو۔ ہاں عہد جاہلیت میں ایسا ہوتا ہو اور اسی کے اثر میں ایسا سمجھا گیا ہو تو وہ الگ بات ہے،مگر وجہ جواز نہیں، کیوں کہ اسلام میں ایسا ہرگز نہیں ہے۔

(۳) پھر یہ کہ باندیوں کا مہر مالک کو دینا،خود قرآن کریم کے خلاف ہے۔

فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ۔(۳۸) تم ان (باندیوں) سے ان کے مالکوں کی اجازت سے نکاح کرو اور دستور کے مطابق ان کے مہر ان کو ادا کرو۔

مہر نکاح کا لازمہ ہے،جس سے نکاح ہوگا۔مہر بھی اسی کا حق ہوگا۔یہ قرآنی حکم ہے۔ اس لیے یہ دعویٰ بھی قابل قبول نہیں ہوسکتا کہ باندیوں کے مہر کے حق داران کے مالک ہوں گے۔ پھر وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ میں ھن کی ضمیر نے مہر کا اصلی حق دار خود متعین کردیا ہے۔اس لیے اس پر دورائے ہو ہی نہیں سکتیں۔

(۴) اسلام نے غلامی کو ختم کرنے کی تدبیر کی ہے۔نہ کہ اسے باقی رکھنے یا آگے بڑھانے کی۔اس ضمن میں قرآن مجید کے متعدد احکام پیش کیے جاسکتے ہیں۔قرآنی حکمتوں سے

واقف کوئی بھی شخص یہ باور نہیں کرسکتا کہ اسلام غلامی کو اولاد در اولاد چلانا چاہتا ہے۔ اس لیے باندی کی اولاد کا پیدائشی غلام ہونا اسلام کی رو سے محل نظر ٹھہرتا ہے۔ پھر ویسے بھی اگر باندی کا نکاح کسی آزاد سے ہوا ہو تو قرآنی اصول کے مطابق (۳۹) نسباً اس کی اولاد آزاد تصور ہونی چاہیے نہ کہ غلام۔ ہاں اگر باندی کا نکاح کسی غلام سے ہوا ہے تو پھر اولاد غلام تصور ہوسکتی ہے۔ مگر اسلام نے ایسے ہی لوگوں کو مکاتب بننے کی راہ سجھا کر رقیت سے آزاد کرایا ہے۔ اس لیے ایسے جوڑوں کو ملک یمین بنائے رکھنا۔ قرآنی تعلیمات سے ہم آہنگ نظر نہیں آتا۔

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے سورہ النساء: ۲۵ کے تحت اپنے حاشیہ میں ''فائدہ'' کے عنوان سے لکھا ہے:

> ''ہاں! اگر کسی کے نکاح میں آزاد عورت ہو تو اس کو لونڈی سے نکاح کرنا سب کے نزدیک حرام ہے''۔ (۴۰)

ہمیں اس مسئلہ کی صحت پر کلام ہے۔ قرآن کریم نے حرہ اور باندی کے اجتماع نکاح کو کہیں بھی حرام نہیں کہا ہے۔ اس لیے اسے حرام نہیں کہا جاسکتا۔ پھر یہ کہ حرہ اور باندی دو سگی بہنوں کی طرح تھوڑی ہیں کہ جن کے اجتماع نکاح کو حرام قرار دیا جائے۔ ہمیں حیرت ہے کہ اس مقام پر علامہ عثمانی نے حرہ کے ساتھ لونڈی کو نکاح میں جمع کرنے پر حرمت کا حکم لگایا ہے۔ جب کہ بغیر نکاح کے، وہ حرہ کے ساتھ نہ صرف ایک باندی بلکہ متعدد باندیوں کے ساتھ مجامعت کو جائز سمجھتے ہیں۔ ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

> ''چاہو تو ایک منکوحہ کے ساتھ یا چند لونڈیوں کو جمع کرلو''۔ (۴۱)

عہد جاہلی کی اس صدائے بازگشت پر سوائے افسوس کے ہم کچھ نہیں کر سکتے۔

(باقی)

حواشی

(۱) النساء/ ۳۶۔ النحل/ ۷۱۔ النور/ ۵۸۔ الروم/ ۲۸۔ (۲) النور/ ۳۱۔ ۵۵۔ (۳) النساء/ ۳۔ (۴) **فانکحوا ماطاب لکم من النساء** میں ما موصولہ ہے اور طاب کے فعل میں ھُوَ۔ لیکن یہاں ھُنّ ضمیر مستتر ہے۔

کیوں کہ ھُنّ ضمیر مستتر مبین ہے اور من النساء بصیغۂ جمع مؤنث اس کا بیان ہے۔ مبین اور بیان مل کر فعل طاب کا فاعل ہے اور جمع مؤنث کے لیے فعل مذکر کا استعمال قرآن کریم میں موجود ہے۔ جیسے وقال نسوۃ فی المدینہ (الیوسف/۳۰) پس طاب لکم من النساء جملہ فعلیہ ہو کر صلہ ہوا ما موصولہ کا۔ صلہ اور موصولہ مل کر ہوا مبدل منہ، جس کا بدل ہے۔ مثنیٰ وثلث وربع۔ اس لیے بدل اور مبدل منہ مل کر فانکحوا کی ضمیر مستتر (انتم) کا مفعول ہے۔ (۵) الصافات/ ۲۸۔ (۶) الواقعہ/ ۵۶۔ (۷) البقرہ/ ۲۲۵۔ (۸) التوبہ/۱۲۔ (۹) الحاقہ/ ۴۶۔ (۱۰) اس آیت کے دو طرح سے ترجمے کیے گئے ہیں۔ طرحِ اول کے ترجمہ کی مثال یہ ہے۔ ''تو ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے''۔ (مفتی محمد تقی عثمانی) اس ترجمہ میں یمین کا لفظ حالت مفعولی میں پڑا ہوا ہے۔ اس طرح کے تراجم کے لیے مولانا محمد جونا گڑھیؒ، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ وغیرہم کے تراجم دیکھے جاسکتے ہیں۔ طرح دوم کے ترجمہ کی مثال یہ ہے۔ ''تو یقیناً ہم ان کو پوری قوت وقدرت کے ساتھ پکڑ لیتے''۔ (پروفیسر محمد طاہر القادری) اس ترجمہ میں یمین کا لفظ حالت فاعلی کا پتہ دے رہا ہے۔ اس طرح کے تراجم کے لیے درج ذیل مترجمین کے تراجم ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، مولانا احمد رضا خان بریلویؒ، مولانا ثناءاللہ امرتسریؒ، غلام احمد پرویز، مولانا امین احسن اصلاحیؒ اور علامہ غلام رسول سعیدیؒ وغیرہم۔ (۱۱) وقولھم ملک یمینی انفذ و ابلغ من قولھم فی یدی، ولھذا قال تعالیٰ (مما ملکت ایمانکم) المفردات فی غریب القرآن، کتاب الیاء، نور محمد، کارخانۂ تجارتِ کتب، آرام باغ، کراچی، سنہ اشاعت درج نہیں۔ (۱۲) النساء/ ۲۵۔ (۱۳) النساء/ ۲۵۔ (۱۴) تدبر قرآن، ج: دوم، ص: ۲۵۴، فاران فاؤنڈیشن، فیروز پور روڈ، اچھرہ، لاہور، طبع اوّل ۱۹۸۳ء۔ (۱۵) ایضاً، ص: ۲۸۰۔ (۱۶) تبیان القرآن، ج: دوم، فرید بک اسٹال، اردو بازار، لاہور، الطبع الثانی، ۲۰۰۱ء۔ (۱۷) النساء/ ۲۵۔ (۱۸) ایضاً، ص: ۶۲۳، ایضاً۔ (۱۹) محمد/۴۔ (۲۰) تدبر قرآن، ج: دوم، ص: ۲۷۷۔ (۲۱) ترجمان القرآن۔ (۲۲) تفہیم القرآن، ج: اول، مکتبۂ تعمیر انسانیت، اندرون موچی دروازہ، لاہور، اٹھارواں ایڈیشن، ۱۹۸۱ء۔ (۲۳) تفہیم القرآن، ج: اول، سورۃ النساء، حاشیہ ۶، ایضاً۔ (۲۴) موضح فرقان، اردو ترجمہ، مجمع الملک فہد لطباعۃ المصحف الشریف المملکۃ العربیۃ السعودیہ، سنہ اشاعت درج نہیں۔ ان کے علاوہ جن مترجمین نے لونڈیوں کو مال قرار دیا ہے۔ ان میں شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ (احسن الفوائد، مطبوعہ، ۱۳۰۷ھ مطبع مجتبائی دہلی، (بھارت)) مولوی حمید اللہؒ (تفسیر القرآن بالاحادیث نبوی، مطبع فاروقی، دہلی،

۱۳۱۵ھ) مولوی انشاءاللہ (تفسیر القرآن، مطبع حمیدیہ سٹیم پریس، لاہور) مولوی حسین علی واں بچھراںؒ (جواہر القرآن) مولانا حافظ محمد ادریس کاندھلویؒ (معارف القرآن) اور مولوی سید محمد حسینؒ (تفسیر تنویرالبیان، مطبع نورالٰہی آگرہ، بھارت) وغیرہ شامل ہیں۔ (۲۵) حاشیہ برموضح فرقان ازمولانا محمود حسنؒ، العربیۃ السعودیۃ۔ (۲۶) النساء/۲۵۔ (۲۷) لغت کی رو سے اَوحرف عطف ہے۔ جو حسب استعمال مختلف مقامات پر از روئے سیاق وسباق مختلف معانی دیتا ہے۔ کہیں یہ تشکیک کے معنی دیتا ہے۔ (الکہف/۱۹) کہیں یہ ابہام کے معنی دیتا ہے۔ (السبا/۲۴) کہیں یہ اضراب کے معنی دیتا ہے۔ (الصافات/۱۴۷) کہیں یہ تقسیم کے معنی دیتا ہے۔ (المائدہ/۶) کہیں یہ تعمیم کے معنی دیتا ہے۔ (النساء/۱۲۴) اور کہیں یہ تفسیر کے معنی دیتا ہے۔ (آل عمران/۱۶۷) یوں اَو کا حرف از روئے استعمال یا کے علاوہ یا شاید یا پھر بلکہ خواہ اور یعنی وغیرہ جیسے معانی کو ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ ان صورتوں کے علاوہ بھی اَو کے استعمال کی صورتیں مزید درمزید ہیں اور تراجم بھی مزید درمزید۔ (۲۸) تفہیم القرآن، ج: اول، ص: ۳۴۰ (۲۹) النساء/۲۴۔ (۳۰) لیکن بعض حالات اور وجوہات کے سبب "ماوراء ذلکم" سے بھی نکاح جائز نہیں ہوتا اور وہ ممانعت دوسری آیات کے ماتحت ہے۔ مثلاً تین بار کی مطلقہ سے نکاح حرام ہے۔ لا تحل لہ من بعد حتی تنکح زوجاً غیرہ (البقرہ/۲۳۰) یا مشرک عورت سے ولا تنکحوا المشرکت (البقرہ/۲۲۱) یا چار کی موجودگی میں پانچویں عورت سے (النساء/۳) یا جس سے لعان ہو چکا۔ لا یجتمعان ابدا (الحدیث)۔ (۳۱) سرسید احمد خانؒ نے اس جگہ محصنت کا معنی آزاد عورتوں سے ہی کیا ہے۔ تفسیر القرآن، ص: ۴۶۵، دوست ایسوسی ایٹس، الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور، ۱۹۹۸ء (تشکیل اوج)۔ (۳۲) تفسیر عروۃ الوثقی، ج: دوم، ص: ۱۲-۱۳-۱۷، اشاعت اول، ۱۹۹۵ء، مکتبۃ الاثریۃ، جناح اسٹریٹ، گجرات، پاکستان (۳۳) تفہیم القرآن۔ (۳۴) عرفان القرآن، منہاج القرآن پبلی کیشنز، اشاعت ہفت دھم (۱۷) ۲۰۰۶ء۔ (۳۵) النساء/۲۵۔ (۳۶) تبیان القرآن، ج: دوم، ص: ۶۳۹۔ (۳۷) البقرہ/۲۲۸۔ (۳۸) النساء/۲۵۔ (۳۹) الاحزاب/۵۔ (۴۰) حاشیہ برموضح قرآن، ص: ۱۰۵۔ (۴۱) ایضاً، ص: ۱۰۰۔

میرزا مظہر جان جاناں کی فارسی ادبی خدمات

ڈاکٹر عصمت درانی

شمس الدین حبیب اللہ میرزا جان جاناں متخلص بہ مظہر (۱۱۱۱-۱۱۹۵ھ/۱۷۰۰-۱۷۸۱ء) ہندوستان میں سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کے معروف شیخ طریقت، شاعر اور ادیب تھے۔ دہلی میں ان کی خانقاہ مرجع خلائق تھی (رانجھا، ۴۷-۴۸)۔ مولوی نعیم اللہ بہرائچی (م: ۱۲۱۸ھ/۴-۱۸۰۳ء) کی تصنیف معمولات مظہریہ اور شاہ غلام علی دہلوی (م: ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء) کی تصنیف مقامات مظہری، ان کے حالات اور معمولات پر مستند اور مفصل کتب ہیں۔ اس کے علاوہ فارسی اور اردو شعرا کے متاخر تذکروں (سفینۂ خوشگو، مجمع النفائس، سرو آزاد، نکات الشعراء، مخزن الغرائب، تحفۃ الشعراء وغیرہ، مزید تذکروں اور مآخذ کی نشان دہی کے لیے: اکرام، ۴۱۱) اور ادب کی تاریخوں (جیسے جمیل جالبی کی تاریخ ادب اردو) میں بھی ان کے حالات زندگی ضروری تفصیلات کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ یہاں اعادہ کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

میرزا صاحب سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ میں سید نور محمد بدایونی (م: ۱۱۳۵ھ/۲۳-۱۷۲۲ء) کے مرید تھے جو حضرت مجدد الف ثانی کے پوتے شیخ سیف الدین (م: ۱۰۹۶ھ/ ۱۶۸۵ء) کے خلیفہ اور فیض یافتہ تھے۔ میرزا مظہر نے دیگر مشایخ وقت حافظ محمد محسن، حاجی محمد افضل، حافظ سعد اللہ اور شیخ محمد عابد سنامی سے بھی استفادہ کیا تھا اور فارسی قواعد کے رسائل اپنے والد میرزا جان (م: ۱۱۳۰ھ/ ۱۷۱۸ء) سے پڑھے تھے (غلام علی دہلوی، ۲۲۷-۲۳۳، ۲۸۳، ۴۳۱)۔

خود میرزا مظہر سے بہت سے لوگوں نے روحانی استفادہ کیا۔ ان کے مریدوں کی ایک کثیر تعداد تھی۔ ان کے کئی نامور خلفا ہوئے جن میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی، مولوی نعیم اللہ بہرائچی،

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ فارسی، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پور (پاکستان)۔

مولوی غلام یحییٰ بہاری اور شاہ غلام علی دہلوی علمی لحاظ سے نمایاں ہیں۔

میرزا مظہر عرفان وارشاد میں اپنے خاص مقام کے ساتھ ساتھ، فارسی اور اردو زبانوں کے شاعر کے طور پر بھی معروف ہیں اور دونوں زبانوں میں ان کی خدمات قابل ستایش ہیں (جمیل جالبی، ج ۲، ص ۳۶۶-۳۶۷)۔ وہ بعض اوقات اپنی باطنی کیفیات اور روحانی واردات کو ادبیات سے ملا دیتے تھے۔ ان کے ملفوظات میں کئی ایک ایسے واقعات ہیں جن میں باطنی کیفیت اور ادب باہم مربوط ہیں۔ جیسے:

۱- ایک دفعہ خواب میں دیکھا کہ وہ وفات پا گئے ہیں اور لوگوں نے ان کا جنازہ اٹھایا تو اچانک جنازہ ہوا میں اُڑ گیا اور لوگ اس کے پیچھے روانہ ہوئے تو ان کی روح بھی اس کے ہمراہ تھی۔ اس موقع پر ان کو اپنی ہی رباعی یاد آ گئی:

مظہر تشویش چشم گوشی نشوی سرمایہ جوشی و خروشی نشوی
باید کہ بہ پای خود روی تا سر گور ای جوہر پاک بار دوشی نشوی

(غلام علی دہلوی، ۳۱۹)

۲- فرماتے کہ انھیں حضرت ابوبکر صدیقؓ سے بہت محبت تھی۔ اگر کبھی باطنی نسبت پر پردہ پڑ جاتا تو خود بخود حضرت کی طرف رجوع ہو جاتا اور حضرت کے التفات سے ان کی کدورت دور ہو جاتی۔ ایک مرتبہ انہوں نے حضرت ابوبکرؓ کی شان میں ایک قصیدہ کہا، تو حضرت ابوبکرؓ نے ان کے حال پر بہت مہربانی فرمائی۔ (غلام علی دہلوی، ۳۱۹)

۳- فرمایا کہ انھیں حضرت علی مرتضیٰؓ کی خدمت میں خاص نیاز حاصل ہے۔ جسمانی بیماری کے وقت ان کی توجہ حضرت علیؓ کی طرف ہو جاتی جس سے شفا ہو جاتی۔ چنانچہ ایک دفعہ انہوں نے ایک قصیدہ ان کی خدمت میں عرض کیا تو بہت نوازش فرمائی۔ قصیدہ کا مطلع یہ ہے:

فروغ چشم آگاہی امیر المومنین حیدرؓ ترا انگشت ید اللٰہی امیر المومنین حیدرؓ

(غلام علی دہلوی، ۳۱۹)

۴- فرماتے کہ ائمہ اہل بیت کی محبت ایمان کا موجب اور تصدیق وایقان کا سرمایہ ہے اور ان کی محبت کے سوا اور کوئی عمل وسیلۂ نجات نہیں۔ پھر اپنی زبان سے یہ شعر پڑھا:

نکرد مظہر ما طاعتی و رفت بہ خاک نجات خود بہ تولاے بوتراب گذاشت
(غلام علی دہلوی، ۳۲۰)

ہم یہاں میرزا مظہر کی فارسی خدمات کا مختصر جائزہ لیں گے۔

میرزا مظہر فارسی ادب میں اپنے دیوان اور فارسی شاعری کے ایک مقبول انتخاب خریطۂ جواہر کی بدولت جانے جاتے ہیں۔ اگر چہ ان کے کچھ خطوط اور ملفوظات بھی فارسی میں ملتے ہیں۔

دیوان میرزا مظہر جان جاناں (فارسی): میرزا مظہر نے اپنے فارسی دیوان پر جو دیباچہ تحریر کیا ہے اس میں ان کے مختصر ذاتی حالات اور دیوان کی تدوین کی روداد شامل ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ: یہ دیوان انھوں نے ساٹھ سال کی عمر میں ۱۱۷۰ھ/ ۱۷۵۷ء میں ایسے وقت میں انتخاب اور مرتب کیا ہے جب وہ اپنے مشایخ طریقت کے حکم سے گوشہ نشینی اختیار کیے ہوئے تھے۔ جوانی کے دنوں میں شور عاشقی کے تقاضے پر وہ شاعری بھی کیا کرتے تھے لیکن کبھی اپنے مسودات اور کلیات جمع کرنے کا اہتمام نہ کیا۔ اس طرح بیشتر شعری سرمایہ ضایع ہو گیا اور جو باقی بچا اس میں کاتبوں اور نقل نویسوں نے نمایاں تصرفات کر کے غلط نسخے رائج کر دیے اور جاہل لوگوں نے بے انصافی سے کام لیتے ہوئے، ان غلطیوں کو شاعر سے منسوب کر دیا اور بات کی تہہ تک پہنچے بغیر شاعر کو قصور وار ٹھہرایا۔ اس کم فرصتی میں جب کہ سفر آخرت کی فکر پہلے سے زیادہ ہے، اعتراض کرنے والوں کے ہاتھوں پہنچنے والے نقصان کی تلافی کیا ہوتی، لیکن ایک ''نو جوان سراپا جان'' نے انھیں اپنے اشعار جمع اور تصحیح کرنے کے لیے کہا۔ چنانچہ متعدد بیاضوں سے چھان پھٹک کے بعد بیست ہزار اشعار سے تقریباً ایک ہزار اشعار کا انتخاب ہو پایا، وہ بھی ردیف کی ترتیب کے بغیر اور اکثر غزلیں نامکمل تھیں۔ جو کچھ انھیں اپنے پرانے مسودات سے دستیاب ہوا اس کا انتخاب اس مدون دیوان میں درج کر دیا گیا ہے اور جو کچھ اس سے باہر ہے اسے نظر انداز کر دیا جائے اور درخور اعتناء نہ سمجھا جائے۔ تقریباً بیس سال پہلے (۱۱۵۰ھ/ ۱۷۳۷ء) ایک عزیز نے ان کے کچھ اشعار مرتب کر کے انھیں دکھائے تھے اور ان سے دیباچے کی درخواست کی تھی جو چند سطور میں لکھ دیا گیا لیکن اب اس کو معتبر نہ جانا جائے کیوں کہ وہ سب باتیں موجودہ دیوان

کے دیباچے میں بھی آ گئی ہیں (مظہر، ص ۳-۴)۔

۱۱۵۰ھ/ ۳۷-۱۷۳۷ء میں تدوین ہونے والا دیوان مختصر تھا جس کا ذکر میر تقی میر (ص ۵) نے کیا ہے۔

میرزا مظہر کا خود ترتیب دیا ہوا دیوان پہلی بار ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۴ء بہ اہتمام محمد عبدالرحمان ابن حاجی محمد روشن خان، مطبع مصطفائی، کان پور سے شایع ہوا۔ ناشر نے اس اشاعت پر جو ابتدائیہ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب دانہ پانی انھیں دہلی لایا تو وہ خانقاہ مظہریہ گئے اور شاہ احمد سعید مجددی (م: ۱۲۷۷ھ/ ۱۸۶۰ء) اور شاہ عبدالغنی مجددی بن شاہ ابوسعید (م: ۱۲۹۶/ ۱۸۷۸ء) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور وہاں سے دیوان مظہر مع خریطۂ جواہر کا وہ قلمی نسخہ اشاعت کے لیے مستعار لیا جو میرزا مظہر کے خلیفہ شاہ غلام علی دہلوی کے استعمال میں رہتا تھا (عبدالرحمان، محمد، ص ۲-۳)۔ اس میں صفحہ ۱ تا ۸۹ دیوان مظہر ہے۔ اس مطبوعہ دیوان میں مظہر کی غزلیات، رباعیات، مخمسات (میلی ہروی اور میرزا صائب کی ایک ایک غزل پر)، واسوخت، مختصر مثنویات اور ایک قطعۂ تاریخ (عقد نکاح سید ابوالحسن) شامل ہے۔ صفحہ ۹۰ تا ۱۷۰ خریطۂ جواہر ہے۔ صفحہ ۱۷۱ پر دونوں کتابوں کا ''صحت نامہ'' ہے۔ دیوان کے حاشیے پر جا بجا مشکل الفاظ اور مشکل اشعار کی تشریح کی گئی ہے۔ یہ حواشی ناشر کے تحریر کردہ ہیں۔ کتابت کی غلطیوں سے قطع نظر، جس کی نشان دہی اور اصلاح خود ناشر نے آخری صفحہ پر کر دی ہے۔ اس اشاعت کو مستند کہا جا سکتا ہے کیوں کہ یہ خانقاہ مظہریہ کے قلمی نسخے کی بنیاد پر انجام پائی ہے۔ ناشر یا محشی کے حواشی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پیش نظر کوئی دوسرا نسخہ بھی تھا۔ مثلاً ردیف الف کی ایک غزل (مظہر، ص ۶) کے مقطع:

کفر و دین امروز مظہر نازہا دارد بہ من سرو رعنا ساخت عشقِ میرزا را جا مرا

پر یہ حاشیہ دیا گیا ہے: ''در حاشیۂ نسخۂ دیگر دیدہ شد کہ میرزا راجا نام معشوق مصنف بود''۔ یعنی دوسرے نسخہ کے حاشیہ پر دیکھا گیا کہ میرزا راجا مصنف کے معشوق کا نام ہے۔

۱۲۷۱ھ کے بعد بھی دیوان مظہر کی اشاعتیں مطبع مصطفائی کی بنیاد پر ہوتی رہی ہیں۔ نوشاہی (کتاب شناسی، ج ۳، اندراج ۹۰۸۶) نے اس کی مزید تین اشاعتوں کا ذکر کیا ہے:

۱۳۰۹ھ/ ۹۲-۱۸۹۱ء، مطبع مفید دکن، حیدر آباد، بہ اہتمام ابو رجا محمد عبدالقدیر نقشبندی

احمدی، ۱۴۰ صفحہ۔ مجددی (ص ۱۴۰) نے اسی اشاعت کو غلطی سے مطبع مفید عام کی اشاعت بتایا ہے۔

۴۱-۱۳۴۰ھ/۱۹۲۲ء، مطبع کانشی رام، ناشر: الٰہی بخش ومحمد جلال الدین، لاہور، صفحہ ۱ تا ۶۲ دیوان مظہر اور اس کے بعد خریطۂ جواہر ہے۔ بقول مجددی (ص ۱۳۴) یہ اشاعت اغلاط سے پُر ہے۔

۱۴۰۸-۱۴۰۹ھ/۱۹۸۸ء، المصطفیٰ اکادمی، حیدرآباد سندھ؛ ۱۲۷۱ھ اشاعت کا عکس ہے۔

برصغیر پاک و ہند کے مختلف کتب خانوں میں دیوان مظہر کے متعدد قلمی نسخے موجود ہیں۔ متاخر دور کی تصنیف اور مطبوعہ ہونے کے باوجود، اس کے قلمی نسخوں کی کثرت اس بات کی دلیل ہے کہ میرزا مظہر کا فارسی کلام بے حد مقبول تھا۔ ہندوستان میں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، کولکتہ (Ivanow, 875-876) اور سالار جنگ میوزیم اینڈ لائبریری، حیدرآباد (Muhammad Ashraf, 2137-2139) میں نسخوں کے علاوہ پاکستان کے نجی اور سرکاری کتب خانوں دیوان مظہر کے کم از کم ۱۹ نسخوں کے کوائف منزوی (ج ۸، ص ۱۱۴۳-۱۱۴۵) نے فراہم کیے ہیں۔

صرف مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں دیوان مظہر کے سات قلمی نسخے ہیں۔ جن کی تفصیل ڈاکٹر عطا خورشید صاحب نے حسب ذیل فراہم کی ہے:

۱- جواہر گلکشن، نمبر ۷۵۹: کاتب: سرفراز علی ولد محمد منیر کمبوہ؛ تاریخ کتابت: ۱۵ ربیع الاول ۱۱۹۸ھ؛ ۳۱ ورق۔

۲- جواہر گلشن، نمبر ۷۵۵: کاتب کا نام مٹا دیا گیا ہے۔ تاریخ کتابت ۲۵ / جمادی الثانی ۱۲۲۱ھ؛ ۴۶ ورق۔

۳- حبیب گنج کلکشن، نمبر ۴۷/۱۲۶: کاتب: محمد محبّ اللہ؛ سنہ کتابت ندارد؛ نواب محمد مبارک علی خاں ابن نواب یوسف علی خاں والی رام پور کی فرمائش پر لکھا گیا نہایت ہی خوشخط نسخہ۔

۴- حبیب گنج کلکشن، نمبر ۵۵/۵۰: ترقیمہ ندارد، ۵۰ ورق۔

۵- یونیورسٹی کلکشن ضمیمہ فارسی ادب: نمبر ۱۰۲: آخری ورق غائب۔

۶- شیفتہ کلکشن، نمبر ۱۳۹/۱۷۵: ترقیمہ ندارد؛ ۴۴ ورق۔

۷- سبحان اللہ کلکشن ضمیمہ، نمبر ۹۲/۱۱۵۵ء۸۹۱: ناقص الآخر؛ کل ۹ ورق۔

نوشاہی (پنجاب، ج ۲، ص ۱۰۴۱-۱۰۴۲) نے پنجاب یونیورسٹی سنٹرل لائبریری، لاہور کے ذخیرۂ پیرزادہ کے ایک نسخے (نمبر PPi/VI/19B/1595) کو متعارف کیا ہے جس کی تاریخ کتابت واضح طور پر ۲۴ ذی الحجہ ۱۱۶۱ھ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ نسخہ دیوان مظہر کی تدوین اول (۱۱۵۰ھ/ ۱۷۳۷ء) کی کوئی نقل ہے کیوں کہ تدوین دوم، اس نسخے کی تاریخ کتابت سے ۹ سال بعد، ۱۱۷۰ھ میں ہوئی تھی مجددی (ص ۱۳۴) کے بقول "دیوانِ اول (مرتبہ ۱۱۵۰ھ) کے کسی خطی نسخہ یا طباعت کا ہمیں علم نہیں ہے۔ ویسے حضرت مظہر نے اسے خود ہی رد کر دیا تھا اور فرمایا تھا کہ یہ تمام دیوان ثانی میں شامل ہے"۔ پنجاب یونیورسٹی کے نسخے کی موجودگی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ دیوان اول کا نسخہ موجود ہے۔ میرزا مظہر نے اسے رد بھی نہیں کیا تھا۔ میرزا مظہر نے صرف اس پر اپنا تحریر کردہ دیباچہ منسوخ کیا تھا جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں "پیش ازین بیست سال، عزیزی، مشتی از اشعار فقیر فراہم آوردہ، بہ عرض فقیر رسانیدہ، تمنای تحریر عنوانش کردہ بود۔ سطری چند از قلم ریختہ؛ حالا آن را معتبر نشناسند کہ آن مطالب در ضمن این عبارات داخل است"۔ (مظہر، ۴) یعنی آج سے بیس سال پہلے، ایک عزیز نے فقیر کے کچھ اشعار جمع کیے اور مجھے دکھا کر اس کا دیباچہ لکھنے کی درخواست کی۔ چنانچہ چند جملے لکھ دیے گئے لیکن اب اس تحریر کو معتبر نہ جانا جائے کیونکہ وہ سب باتیں میرے موجودہ دیباچے میں آ گئی ہیں۔

دیوان اول کی موجودگی کی نشان دہی دیوان ثانی کے ناشر محمد عبدالرحمان نے اپنے حواشی میں بھی کی ہے۔ دیوان ثانی (مطبوعہ ۱۲۷۱ھ) کے صفحہ ۸۵ پر دس اشعار کی ایک مثنوی درج ہوئی ہے، جس کا مطلع ہے:

خدا در انتظار حمد ما نیست محمد چشم بر راہ ثنا نیست

اس مثنوی کے بارے میں حاشیہ نویس نے لکھا ہے "این اشعار در ہر دو دیوان یافتہ نشد"، یعنی یہ اشعار دونوں دیوانوں میں نہیں ملے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ۱۲۷۱ھ تک، جو اس دیوان کی طباعت کا سال ہے، مظہر کے دونوں دیوان دستیاب تھے۔

ایک پاکستانی طالبہ شاذیہ تبسم نے نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد سے ایم اے (ادبیات فارسی) کی سند کے لیے دیوان میرزا مظہر جان جانان کی تصحیح و تعلیقات و حواشی لکھنے

کا کام پروفیسر ڈاکٹر سید مصطفوی سبزواری کی نگرانی میں تعلیمی سال ۱۹۹۹-۲۰۰۱ء میں انجام دیا۔ یہ امتحانی مقالہ حسب ذیل ۶ ابواب پر مشتمل ہے۔۱- پیش لفظ،۲- مصحح کا مقدمہ،۳- میرزا مظہر جان جانان کے حالات زندگی،۴- دیوان مظہر کا متن،۵-تعلیقات اور توضیحات،۶- کتابیات۔ دیوان کی تدوین میں طالبہ نے دو قلمی نسخے اور ایک مطبوعہ نسخہ استعمال کیا ہے۔ قلمی نسخوں میں گنج بخش لائبریری، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد کے دو نسخے (نمبر 7530 اور 2082) شامل ہیں۔ پہلے نسخے کی تاریخ کتابت ۹ شوال ۱۳۵۳ھ اور کاتب کا نام محمد سعید الدین ہے۔ دوسرا نسخہ بلا تاریخ ہے۔ مطبوعہ نسخہ مطبع مصطفائی، کان پور، ۱۲۷۱ھ کا ہے۔ معلوم ہے کہ طالبہ نے تدوین کے لیے جن قلمی نسخوں کا انتخاب کیا ہے وہ معیاری نہیں ہیں۔ ایک نسخہ بہت متاخر ہے اور دوسرے کی تاریخ ہی نہیں ہے، جب کہ اس سے بہتر اور قدیم نسخے پاکستان میں موجود ہیں (دیکھیے منزوی، ج ۸، ص ۱۱۴۳-۱۱۴۵)۔ طالبہ نے ایک غلطی یہ کی ہے کہ مطبوعہ نسخے کے ناشر محمد عبدالرحمان بن محمد روشن خان کو نسخے کا کاتب قرار دیا ہے (شاذیہ تبسم، ص ۲) اس تصحیح میں خریطۂ جواہر شامل نہیں ہے۔

خریطۂ جواہر:　　یہ میرزا مظہر کی وہ بیاض ہے جس میں انھوں نے دوسرے شاعروں کا اپنا پسندیدہ کلام درج کیا ہے۔ میرزا مظہر کی زندگی ہی میں اس کی نقلیں تیار ہو کر مقبول ہو گئی تھیں۔ میرزا مظہر نے اسے ''بیاض انتخابی'' کہا تھا جو بعد میں خریطۂ جواہر کے نام سے شایع ہوئی۔ اس میں قدیم و جدید تقریباً پانچ سو ہندوستانی، ایرانی اور وسطی ایشیائی شعرا کے کلام کا انتخاب ہے۔ اپنے کلام کا انتخاب بھی خاصی مقدار میں دیا ہے۔ نسبتاً کم معروف شعرا کا انتخاب خاص اہمیت کا حامل ہے، جیسے حاجی محمد اسماعیل غافل، میر علی اصغر فنائی، ابوتراب بیگ فرقی انجدانی، مرزا نقی شاہ واحد وغیرہ۔ خریطۂ جواہر کا آغاز ابوسعید ابوالخیر کی فارسی رباعیات سے ہوتا ہے۔ اسی بیاض یا انتخاب کے بارے میں برصغیر کے معروف شاعر مرزا اسداللہ خان غالب (۱۷۹۷-۱۸۶۹ء) نے کہا تھا کہ ہندوستان میں فارسی شاعری کا صحیح ذوق جو دوبارہ قایم ہوا ہے تو وہ اس انتخاب کی وجہ سے ہوا ہے۔ (شبلی نعمانی، مقالات شبلی، ج ۵، ص ۱۲۲)۔

خریطۂ جواہر بھی کئی بار شایع ہو چکا ہے۔ پہلی بار دیوان مظہر کے ساتھ ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۴ء

میں مطبع مصطفائی، کان پور میں طبع ہوا (صفحہ ۹۰ تا ۱۷۰)۔ یہ بھی اسی قلمی نسخے پر مبنی ہے جو شاہ غلام علی دہلوی کے استعمال میں تھا۔ دوسری بار ۱۹۲۲ء میں دیوان مظہر کے لاہور ایڈیشن کے ساتھ صفحہ ۶۳ تا ۱۴۲ شایع ہوا۔ خریطہ کا ایک انتخاب مع اردو ترجمہ و توضیح شاہ معین الدین ندوی (م:۱۹۷۴ء) نے تیار کیا جو سید صباح الدین عبدالرحمان کے دیباچے کے ساتھ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ سے ۱۹۷۵ء میں شایع ہوا۔ (رحمت اللہ خان شروانی و عابد رضا بیدار، ''دارالمصنّفین سے بیاض مظہر جان جاناں ''خریطۂ جواہر'' کا شایع شدہ ایڈیشن''، معارف، اعظم گڑھ، دسمبر ۲۰۰۵ء، ص ۴۲۱-۴۴۱)۔

خریطۂ جواہر کے دو قلمی نسخے بھی پاکستان میں دستیاب ہیں۔ ایک مرحوم ڈاکٹر مولوی محمد شفیع، لاہور (نمبر 370/218) کے ذاتی کتب خانے میں اور دوسرا گنج بخش لائبریری، اسلام آباد (نمبر 753) میں۔ (منزوی، ج ۸، ص ۱۱۴۵)۔ مولوی محمد شفیع کے نسخے کی تاریخ کتابت تقریباً ۱۱۶۰-۱۱۶۱ھ بتائی گئی ہے۔ دوسری بات یہ قابل ذکر ہے کہ پاکستان کے اس نامور عربی فارسی محقق (مولوی محمد شفیع مرحوم) کا کتب خانہ ان کی وفات (۱۹۶۳ء) کے کچھ عرصہ بعد ہی تلف ہونا شروع ہو گیا تھا اور اب ان کے مکان پر کچھ نہیں بچا۔ معلوم نہیں خریطۂ جواہر کا یہ نسخہ کہاں گیا؟

رقعات/مکتوبات: میرزا مظہر کے خطوط یا مکتوبات کے کئی مجموعے ملتے ہیں۔ جو مختلف اوقات میں مرتب ہوتے رہے۔

میرزا مظہر کے کچھ احباب نے ان سے شریعت اور طریقت کے بعض مسایل دریافت کیے تھے۔ ان کا جواب خطوط کی صورت میں دیا گیا۔ یہ خطوط محفوظ کر لیے گئے اور میرزا مظہر نے انھیں اپنی زندگی ہی میں مرتب کروا لیا تھا۔ یہ کل ۲۳ خطوط ہیں۔ جن کی تلخیص مولوی نعیم اللہ بہرائچی نے معمولات مظہریہ میں دی ہے۔ یہ گویا ان کا منظر عام پر آنے والا پہلا مجموعۂ خطوط ہے۔

شاہ غلام علی نے ایک خط کے اضافے کے ساتھ مقامات مظہری میں ۲۴ خطوط نقل کیے ہیں۔

بعد میں ان خطوط کی تعداد پر اضافہ ہوتا رہا اور ''رقعات کرامت سعادت شمس الدین حبیب اللہ مرزا جان جاناں مظہر شہید'' کے نام سے جو نسخہ مطبع فتح الاخبار، کول (علی گڑھ، ہند) سے ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۴ء میں طبع ہوا تھا اس میں کل ۶۳ خطوط (۵۵ صفحات) ہیں (نوشاہی، کتاب شناسی،

ج ا، اندراج ۲۲۵۸)۔ اس مجموعے میں ان لوگوں کے نام بھی درج ہیں جن کو یہ خطوط لکھے گئے تھے۔ یہ خطوط مذہبی مسائل، تصوف کے رموز اور سلوک کی تعلیمات پر مشتمل ہیں۔

میرزا مظہر کے کچھ اور خطوط جن کی تعداد ۸۹ ہوتی ہے اور ان میں مولوی نعیم اللہ کے مرتبہ خطوط بھی شامل ہیں، ابوالخیر محمد بن احمد مراد آبادی نے اپنی کتاب کلمات طیبات کے باب اول کی فصل دوم میں شامل کیے ہیں۔ یہ کتاب کئی بار شایع ہوچکی ہے۔ مطبع مطلع العلوم، مراد آباد سے ۱۲۸۶ھ/ ۱۸۶۹ء اور ۱۳۰۳ھ/ ۱۸۸۶ء اور ۱۳۰۸ھ/ ۱۸۹۱ء اور ۱۳۱۱ھ/ جون ۱۸۹۴ء میں اور ایک بار مطبع مجتبائی، دہلی سے ۱۳۰۹ھ/ دسمبر ۱۸۹۱ء میں بہ تصحیح حافظ محمد فضل الرحمان شایع ہوئی۔ (نوشاہی، کتاب شناسی، ج ا، اندراج ۲۴۱۱؛ مجددی، ۱۳۸)۔

میرزا مظہر کے فارسی خطوط کا ایک اور جامع مجموعہ عبدالرزاق قریشی مرحوم نے مکاتیب میرزا مظہر کے نام سے مرتب کیا اور علوی بک ڈپو، بمبئی، ۱۹۶۶ء سے شایع ہوا (نوشاہی، ج ا، اندراج ۲۵۰۵)۔ اس میں ۱۴۷ خطوط شامل ہیں۔ ان میں سے ۱۳۰ خطوط قاضی ثناءاللہ پانی پتی کے نام ہیں۔ یہ خطوط میرزا مظہر کی زندگی کے آخری دور سے متعلق ہیں اور زیادہ تر ان کی ذاتی زندگی سے متعلق ہیں۔ اصل خطوط زید ابوالحسن فاروقی، دہلی کے ذاتی ذخیرے میں محفوظ تھے۔ اس مجموعے کا اردو ترجمہ ڈاکٹر محمد عمر نے کیا جو ''مکاتیب میرزا مظہر (جان جانان)'' کے نام سے خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ہند سے ۱۹۹۵ء میں شایع ہوا۔

میرزا مظہر کے خطوط کا ایک مجموعہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان (شعبۂ اردو، سندھ یونیورسٹی، جام شورو) نے لوائح خانقاہ مظہریہ کے نام سے ۱۹۷۲ء میں مرتب کیا۔ جس میں ۱۰ خطوط میرزا مظہر کے اور باقی خطوط سلسلۂ مظہریہ کے وابستگان کے ہیں۔ یہ کتاب حیدرآباد، سندھ سے ۱۹۷۵ء میں شایع ہوئی۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان نے اپنے ایک مقالہ ''حضرت مظہر جان جانان کے چند غیر مطبوعہ خطوط''، مطبوعہ مجلّہ اردو، کراچی، جلد ۴۳، شمارہ ۴، اکتوبر ۱۹۶۷ء، صفحہ ۵-۱۵ میں میرزا مظہر کے چند نو دریافت خطوط چھاپے ہیں۔ (نوشاہی، ج ا، اندراجات ۲۴۴۶؛ ۲۵۶۵)

خلیق انجم نے مظہر جان جانان کے خطوط کے نام سے میرزا مظہر کے خطوط کا اردو ترجمہ کیا جو مکتبۂ برہان، دہلی، ۱۹۶۲ء سے شایع ہوا ہے۔ اس میں ۹۱ خطوط ہیں جو زیادہ تر کلمات

طیبات اور رقعات کرامت سے ماخوذ ہیں۔

تمام خطوط میں میرزا مظہر کا اسلوب بہت سادہ ہے اور جن کے نام خطوط لکھے گئے ہیں ان کے لیے القاب میں بھی مبالغہ نہیں ہے۔ ان خطوط میں شریعت اور طریقت کے مسائل کی تشریح کے ساتھ ساتھ عصری معلومات بھی ملتی ہیں۔ اٹھارھویں صدی عیسوی کے بعض سیاسی واقعات پر تبصرہ بھی موجود ہے۔

میرزا مظہر کے خطوط کے جو قلمی نسخے پاکستان میں دستیاب ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱- گنج بخش، اسلام آباد (نمبر 1552)، کاتب محمد جان بن میرزا محمد اکبر، تاریخ کتابت صفر ۱۲۹۳ھ، ایک مجموعۂ رسائل میں، صفحہ ۴۵۷-۵۳۶ (منزوی، ج ۳، ص ۱۹۸۲)؛ پہلا مکتوب یہ ہے ''برخوردار مکرم! التماس تحریر نسب وحسب از فقیر کردہ اند۔ چون فایدہ معتد بہا بر آن مترتب نبود'' یہ وہی خط ہے جو کلمات طیبات میں پہلے مکتوب کے طور پر شامل ہے۔

۲- مکتبۂ سلیمانیہ، ساہیوال، ضلع سرگودھا، بغیر نمبر کے، کاتب عبداللہ بن مولوی عبیداللہ حنفی قادری، بلا تاریخ، ۱۲۸ صفحات۔ (منزوی، ج ۳، ص ۱۹۸۲) پہلا خط وہی ہے جو کلمات طیبات میں پہلے مکتوب کے طور پر شامل ہے۔

۳- نیشنل میوزیم آف پاکستان، کراچی (نمبر N.M.1957-1056/4)، کاتب عبدالکریم، تاریخ کتابت ۱۳۰۳ھ، رسائل نقشبندیہ کے ساتھ ہے (نوشاہی، موزہ، ص ۲۲۸)۔

میرزا مظہر کی کچھ متفرق فارسی تحریریں حسب ذیل ہیں:

خودنوشت حالات برائے سفینۂ خوشگو تالیف بندرابن داس خوشگو (تصنیف ۱۱۶۱ھ/ ۱۷۴۸ء)، سفینۂ خوشگو، دفتر ثالث، مرتبہ شاہ محمد عطاء الرحمان عطا کاکوی، مطبوعہ پٹنہ، ۱۹۵۹ء، ص ۳۰۲ پر موجود ہے۔

خودنوشت حالات برائے تذکرۂ سرو آزاد تالیف میر غلام علی آزاد بلگرامی (تصنیف ۱۱۶۶ھ/۱۷۵۲ء)، سرو آزاد، مطبوعہ لاہور، ۱۹۱۳ء، ص ۲۳۲-۲۳۳ موجود ہے۔

دیباچۂ دیوان فارسی (دوم) (۱۱۷۰ھ/ ۱۷۵۶ء)، مطبوعہ ۱۲۷۱ھ و مابعد کے ساتھ

موجود ہے۔

تقریظ بر رسالہ کلمات الحق تالیف مولانا غلام یحیی بہاری (۱۱۸۴ھ/ ۱۷۷۰ء) ، مقامات مظہری اور کلمات طیبات میں بھی شامل اور مطبوع ہے۔

لب الاسرار (۱۱۹۱ھ/ ۱۷۷۶ء)، قلمی مخزونہ ذخیرۂ احسن مارہروی، مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (نمبر احسن فارسیہ بذیل نمبر 297.7/39)۔ اس رسالے کے بارے میں ڈاکٹر عطا خورشید صاحب نے مفید معلومات بہم پہنچائی ہیں جو پہلی بار منظر عام پر آ رہی ہیں۔ یہ ۲۶ اوراق پر مشتمل فی صفحہ ۱۳ سطر، فارسی رسالہ ہے۔ کاتب نے کہیں اپنا نام نہیں لکھا ہے۔ آخر میں سرخ روشنائی سے ''۱۱۹۰ ہجری چہارم ذی حجہ'' تحریر ہے۔ یہ کاتب کے قلم سے علاحدہ خط ہے۔ (معلوم نہیں قیصر امروہوی، 150 نے ۱۱۹۱ھ کیوں لکھ دیا)۔ اگر اس تاریخ کو درست مان لیا جائے تو ''لب الاسرار'' کا یہ نسخہ مصنف کی حیات میں لکھا ہوا ہے۔ اسی خط میں پہلے صفحے پر اوپر، بائیں گوشے میں سرخ روشنائی سے ہی رسالے کا نام ''رسالہ لب الاسرار'' تحریر ہے۔ رسالہ بغیر کسی تمہید کے شروع کر دیا گیا ہے۔

یہ دراصل اخلاقی وصوفیانہ قصص کا مجموعہ ہے۔ بعض قصے علما اور صوفیہ کی مجلسوں کے بھی ہیں۔ مثلاً آغاز اس طرح ہے ''قصۂ طفلی (کہ) حروف تہجی آموختن شروع نمودہ۔ ہر گاہ معلمش الف بہ کسر لام تعلیم می کرد، وی بہ فتح لام می خواند۔ معلمش زجری کرد کہ غلط می کنی۔ صاحب سری در آنجا رسید۔ گفت ''ای معلم بس کن کہ از ہمین غلط راہ تعلیم بہ میان آمدہ۔ معلم و متعلم از راہ کثرت شد، ورنہ کیست معلم و کیست متعلم؟''

نسخہ کے ۲۳ اوراق نیچے بائیں گوشے سے پھٹے ہوئے ہیں جس کی زد میں ہر ورق کی چار سطور کا نصف حصہ آ گیا ہے۔ چونکہ تمہید نہیں ہے اس لیے مصنف کا نام بھی مذکور نہیں ہے۔ لیکن دوسرے قصے کا خاتمہ ایک شعر پر ہوتا ہے۔ شعر کا پہلا حصہ دریدہ حصے کی نذر ہو گیا ہے، لیکن دوسرا مصرع باقی ہے۔ ''ملک ترک ہر ہمہ ای جان جان''۔ آخری قصہ سے بھی مصنف کے نام کا پتا چلتا ہے۔ ''قصہ شبی در مراقبہ بودم کہ ندا از غیب آمد کہ ''ای مظہر ہیچ می دانی کہ این رسالہ را نام چیست؟'' گفتم ای شاہباز وحدت تا حال خیال نام او نمودم و چیزی معتبر نمی دانستم کہ نامش مسمی گردانم،

مطلب از ین پرسیدن چیست ؟ از آنم خبر دہ۔ آن شخص ظاہر نمود کہ این رسالہ دراز بود و ظہورش برتو موقوف بود، الحال ظاہرش کردی و نامش لب الاسرار است۔ تو ہم بہ ھمین نام مسمی خواہی کرد''۔

وصیت نامہ (قبل از ۱۱۹۵ھ/۸۰-۱۷۷۱ء)، معمولات مظہریہ مطبوعہ ۱۲۷۵ھ و مابعد میں شامل ہے۔

تنبیہات الخمسہ ، درحقیقت مذہب اھل سنت ورد مذہب شیعہ، مشمولہ بشارات مظہریہ (مجددی، ۱۴۴-۱۴۷)۔

رسالۂ عرفانی، جس کی ابتدا اس عبارت سے ہوتی ہے ''طریقتی کہ بہ تسلیک آنحضرت مجدد الف ثانی سرہندی''۔ اس کا قلمی نسخہ خلافت لائبریری، ربوہ (موجودہ نام: چناب نگر، ضلع سرگودھا، پاکستان) میں موجود ہے۔ اسے ابراہیم بن حافظ کریم بخش نے ۱۲۷۶ھ میں کتابت کیا اور یہ ۱۴ صفحات پر مشتمل ہے (منزوی، ج ۳، ص ۱۴۹۶)۔ مزید تحقیق طلب ہے۔

میرزا مظہر کی فارسی ادب کے لیے خدمات میں اس امر کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ انہوں نے دہلی کے کئی فارسی گو شاعروں کی تربیت کی تھی۔ یہ شعراء میرزا مظہر کی مجلس میں آتے اور استفادہ کرتے تھے۔ اس میں دین و مذہب کی تخصیص نہ تھی۔ چنانچہ دو ہندو منشی بساون لال بیدار دہلوی، سرب سنگھ خاکستر، ثروت اور منشی سناتھ سنگھ بیدار مؤلف ''تاریخ بے بدل'' میرزا کے شاگردوں میں سے تھے (سید عبداللہ، ۱۷۳، ۲۴۹؛ منزوی، ج ۸، ص ۱۱۲۳؛ نوشاہی، انجمن، ۱۴۹)۔

فہرست مآخذ:

اکرام، محمد اکرم، آثار الشعراء، اسلام آباد، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، ۲۰۰۸ء۔

رانجھا، محمد نذیر، تاریخ و تذکرۂ خانقاہ مظہریہ دہلی، لاہور، جمعیت پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء۔

سید عبداللہ، فارسی ادبیات میں ہندوؤں کا حصہ، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۷ء۔

شاذیہ تبسم، مقدمہ، دیوان میرزا مظہر جان جاناں، ایم اے تھیسز (فارسی) نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۱۹۹۹-۲۰۰۱ء (غیر مطبوعہ)۔

شبلی نعمانی، مقالات شبلی، اعظم گڑھ، دار المصنفین، ۱۹۵۵ء۔

عطا خورشید، شعبۂ مخطوطات مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، برقی خط بنام ڈاکٹر عارف نوشاہی، مورخہ ۴ نومبر ۲۰۱۲ء۔

غلام علی دہلوی، مقامات مظہری، تحقیق وتعلیق وترجمہ محمد اقبال مجددی، لاہور، اردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۱ء، اشاعت دوم۔

قیصر امروہوی، سید محمود حسن، فہرست مخطوطات مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ذخیرۂ احسن مارہروی، علی گڑھ، ۱۹۸۳ء۔

مجددی، محمد اقبال، مقدمہ، مقامات مظہری تالیف شاہ غلام علی دہلوی، لاہور، اردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۱ء، اشاعت دوم۔

مظہر، میرزا جان جانان، دیوان میرزا مظہر جان جانان وخریطۂ جواہر، مطبع مصطفائی، کان پور، ۱۲۷۱ھ۔

منزوی، احمد، فہرست مشترک نسخہ ہای خطی فارسی پاکستان، اسلام آباد، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، ۱۹۸۳-۱۹۹۷ء۔

میر تقی میر، نکات الشعرا، اورنگ آباد، ۱۹۳۵ء۔

نوشاہی، عارف، فہرست نسخہ ہای خطی فارسی انجمن ترقی اردو کراچی، اسلام آباد، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، ۱۹۸۴ء۔

نوشاہی، عارف، فہرست نسخہ ہای خطی فارسی موزۂ ملی پاکستان کراچی، اسلام آباد، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، ۱۹۸۳ء۔

نوشاہی، عارف، فہرست نسخہ ہای خطی فارسی کتابخانۂ مرکزی دانشگاہ پنجاب لاہور، تہران، مرکز پژوہشی میراث مکتوب، ۲۰۱۱ء۔

نوشاہی، عارف، کتاب شناسی آثار فارسی چاپ شدہ در شبہ قارہ، تہران، مرکز پژوہشی میراث مکتوب، ۲۰۱۲ء۔

Ivanow,Waldimir,Concise Descriptive Catalogue of the Persian Manuscripts in the collection of the Asiatic Society of Bengal,Calcutta,1985 rp.

Muhammad Ashraf,A Concise Descriptive Catalogue of the Persian Manuscripts in the collection of the Salar Jung Museum and Library,Hyderabad,India, 1969.

راجہ درگا پرساد مہؔر سندیلوی

جناب احمد نوید یاسر ازلان حیدر

سلطنت دہلی کے انحطاط کے بعد یہاں کے ارباب علم و اہل قلم حضرات نے نوزائیدہ چھوٹی بڑی ریاستوں کی طرف کوچ کیا اور ایک بڑی تعداد نے حکومت اودھ کے شہروں اور دارالحکومت میں قیام کیا اور اپنی بیش بہا ادبی تخلیقات سے دنیائے علم و ادب کو روشن کیا، سرزمین اودھ کو اس معاملے میں افضلیت حاصل رہی ہے کہ یہاں دارالحکومت اور بڑے شہروں ہی کے نہیں بلکہ یہاں قصبات کے نامور فرزندوں نے بھی میدان علم و ادب میں اپنے اشہب قلم کی خوب جولانیاں بکھیری ہیں، ان قصبات میں کاکوری، موہان، نیوتنی، بلگرام، کوپامئو، اناؤ، امیٹھی، فتح پور، ملیح آباد وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے، انہیں قصبوں میں ایک مردم خیز قصبہ سندیلہ بھی ہے، سندیلہ لکھنؤ سے متصل ضلع ہردوئی کی تحصیل ہے اور نوابین اودھ کے عہد حکومت میں یہ بیشتر اوقات میں اودھ کی جاگیر، تعلقہ یا محال میں شامل رہا ہے، لکھنؤ اور ہردوئی سے یکساں دوری یعنی لکھنؤ سے ۵۵ کلومیٹر مغرب اور ہردوئی سے ۵۵ کلومیٹر مشرق پر واقع سندیلہ علماء، فضلاء، ادباء، شعراء، شارحین، حواشی نگار، صوفیہ اور اہل ہنر کا مرکز رہا ہے، امتداد زمانہ سے اگرچہ اس کی وہ حیثیت برقرار نہ رہ سکی لیکن یہاں کے اہل قلم کی تصانیف اور انتظام و انصرام سے وابستہ افراد کے ذریعہ بنائی گئی شاندار مساجد، وسیع و عریض محل، سرائیں، لق و دق حویلیاں، صوفیہ کے مزارات و خانقاہیں و دیگر عمارات زبان حال سے اپنے شاندار ماضی کی داستانیں بیان کررہی ہیں اور یہاں کے اہل قلم حضرات کی ادبی کاوشیں یہاں کے ادب و تہذیب کو نمایاں کررہی ہیں۔

قصبہ مردم خیز یعنی سندیلہ نے کئی قدآور شخصیتوں کو جنم دیا، جن میں ایک شخصیت راجہ

بی-۲۰، سیکٹر-ای (نیو) علی گنج لکھنؤ۔

درگا پرساد مہؔر سندیلوی کی بھی ہے مہؔر سندیلوی ان اصحاب کمال میں سے ہیں جن کی ہستی اور فارسی و اردو ادب میں بنائے گئے بے شمار نقش و نگار کو وقت کے ہاتھوں نے طاق نسیاں بنا دیا، درگا پرساد کے ایک بزرگ رائے کنور سین کو عہد نواب شجاع الدولہ (۵۴-۱۷۷۵ء) میں سندیلہ و ملیح آباد کی چکلہ داری ملی تھی اور تب سے اس خاندان نے قصبہ سندیلہ میں سکونت اختیار کر لی تھی ، درگا پرساد کی ولادت یہیں ۱۸۴۶ء میں ہوئی ۔ سندیلہ سے قبل یہ خاندان دلی میں مقیم تھا، وہاں درگا پرساد سے گیارہ پشت قبل راجہ کھیم چندر اکبر اعظم کے داروغۂ محلات کے منصب پر فائز تھے اور نو مینا پانڈے (۱) کے لقب سے مشہور تھے ۔ عہد جہاں گیری میں غریب داس خلف کھیم چند کو تمام ہندوستان کی وقایع نویسی کے منصب پر فائز کیا گیا تو انہوں نے فتح پور بسواں میں توطن اختیار کیا، نیز اس خاندان کو سلطنت دہلی سے لے کر حکومت اودھ تک ہر زمانہ میں مناصب و خطابات ملتے رہے، راجہ کا خطاب اس خاندان کی ایک شخصیت کو غازی الدین حیدر (۲۷-۱۸۱۴ء) کے زمانہ میں مرحمت ہوا اور تب سے یہ لقب اس خاندان کے ہر فرد کے ساتھ جڑ گیا، اس سلسلے میں مہؔر سندیلوی لکھتے ہیں:

> ''الغرض نظامت خیرآباد و محمدی و باڑی و بسواں و سندیلہ و ملیح آباد و
> بانگر مئو و سانڈی و موہان و کاکوری و بیسواڑہ ٹنڈیاؤں و جہاں گیر آباد و محمود آباد و
> علاقہ خاص بیت السلطنت لکھنؤ مدت ہا در تحت فرمان این دودمان بود............در
> ایام غدر خدمت دولت انگلشیہ بجا آوردہ ۔ مورد اعزاز بے پایاں گردید در دربار
> دریار لارڈ کیننگ گورنر جنرل کشور ہند علاقہ سرسوا، ضلع کھیری مع خلعت گراں بہا
> علاوہ ریاست موروثی در انعام یافت'' ۔ (۲)

مہؔر سندیلوی کی تعلیم پانچ سال کی عمر میں مکتب سے ہوئی مگر ابھی مروجہ نصاب کی تحصیل میں مشغول ہی تھے کہ ان کا خاندان کوائف تعطل و تفرقہ کا شکار ہو گیا، اس کے بعد غصب اودھ پھر ۱۸۵۷ء کا انقلاب یکے بعد دیگرے ایسے سانحات ہوئے کہ تعلیم کا سلسلہ برقرار نہ رہ سکا، ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں مہؔر کے والد راجہ دھنپت رائے نے انگریزوں کا ساتھ دیا جس کے بدلے میں انہیں اپنے علاقے کے ساتھ ساتھ لکھیم پور کے کسی رئیس کا ضبط شدہ علاقہ ''سرسوا'' بھی مل گیا۔

اس انقلاب کے سرد ہونے کے بعد مہؔر کی تعلیم کا سلسلہ از سر نو شروع ہوا، چودھری محمد امیر اس کام کے لیے معین کیے گئے اور پھر بقول مہؔر راجہ دھنپت رائے خود بڑے صاحب فضل وکمال (۳) تھے، لہٰذا انہوں نے اپنے ولی عہد کی تعلیم میں زبردست دلچسپی لی۔ مہؔر کو فارسی سے بڑی گہری دلچسپی تھی، ان کے پاس عجم کے علماء، فضلاء وشعراء کی آمد ورفت بھی رہتی تھی جس سے ان کے ذوق کو اور جلا ملتی تھی۔

مہر سندیلوی نے جب دیکھا کہ فارسی کی جگہ زبان اردو بڑی تیزی سے لے رہی ہے تو انہوں نے اردو کی طرف توجہ دی اور مولانا ظہور حسن لکھنوی سے تلمذ اختیار کیا، ان کی صحبت میں مہؔر کو شعر گوئی کا مذاق بھی پیدا ہوا اور ان کے اس ذوق کی دلیل ان کی تمام منظوم ومنثور تصانیف دے رہی ہیں جو اردو اور فارسی میں ہیں، ان کی تصانیف اس طرح ہیں:

گلستان ہند، بوستان ہند، حدیقۂ عشرت، مخزن اخلاق، مثنوی مہر تاباں، مثنوی مہر الفت، تاریخ اجودھیا، پند دل پسند، تاریخ سندیلہ، ارتھ میٹک، جغرافیہ، اردو وفارسی شاعری۔

گلستان ہند: مہؔر سندیلوی کی یہ تصنیف ہندوستان کی تاریخ پر مشتمل ہے، مصنف نے اسے چار دفتروں میں منقسم کیا ہے:

۱-دفتر اول: راجہای ہنود (قبل از اسلام۔ گلستان ہند کے اس دفتر کی ابتداء حمد وثنا منظوم و منثور سے کی گئی ہے اس کے بعد ملکہ وکٹوریہ اور گورنر جنرل کی مدح سرائی کی گئی ہے۔ بعد ازیں مہؔر سندیلوی نے اپنی پریس کا نام کوین پریس رکھنے کی وجہ بتائی ہے۔ پھر دفتر کا آغاز نظم سے ہوتا ہے:

بیا باغبان خبر می ساز کن گل آمد در باغ را باز کن (۴)

اس کے بعد دنیا کے آغاز، تمام دیوی دیوتاؤں کا ذکر، پھر ہندو راجاؤں مثلاً راجہ پرتچھت، راجہ اگنی دہر، راجگان چندربنسی، راجہ بیاس دیو، پانڈووں، ذکر رزم مہابھارت، بھگوان کرشن اور ان کا خاندان، راجہ بکرماجیت اور اس کے جانشینوں کا ذکر اور اس کے بعد پرتھوی راج چوہان کے ذکر میں شہاب الدین محمد غوری کی فتح پر اس دفتر کا اختتام ہوتا ہے۔

۲-دفتر دوم: دورۂ اسلام۔ گلستان ہند کا یہ دفتر بقیہ تینوں دفتروں میں سب سے زیادہ ضخیم ہے، اس کا آغاز ہندوستان میں اسلامی حکومت کے بانی شہاب الدین محمد غوری سے ہوتا ہے اور

تمام سلطنتوں مثلاً مملوک، خلجی، تغلق اور لودی سے ہوتا ہوا مغلیہ سلطنت کے آخری چشم و چراغ یعنی بہادر شاہ ظفرؔ کی وفات پر مکمل ہوتا ہے، اس دفتر کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ اس میں مصنف نے کئی ایسی چیزیں شامل کی ہیں جو دوسری تاریخی کتب میں کم ہی نظر آتی ہیں، مثلاً لڑائیوں کے درمیان بھیجے گئے رقعات، شاعروں کے ذریعہ لکھی گئی تاریخیں اور اس میں سلاطین یا اہم واقعات سے متعلق کچھ ایسی مثنویاں بھی شامل کی گئی ہیں جن کے بارے میں مصنف کی رائے ہے کہ یہ کم یاب ہیں۔

۳-دفتر سوم: دورۂ انگلیسہا تا ۱۸۸۷ء۔ اس دفتر میں انگریزی حکومت کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں، ابتداء ملکہ وکٹوریہ کی تعریف وتوصیف سے ہوتی ہے، اس کے بعد ہندوستان میں منتخب کیے گئے تمام گورنر جنرلوں کی تعریف اور خصوصیات کا ذکر ہے، اور ملکہ وکٹوریہ کے احوال زندگی درج کیے گئے ہیں۔ تصنیف کا اختتام اس شعر پر ہوتا ہے:

الٰہی تا جہاں را نام باشد در جہان باشی بدولت کامیاب وکام بخش وکامران باشی(۵)

۴-دفتر چہارم: مولف اور اس کے اجداد کا ذکر۔ مصنف نے اس دفتر میں اپنا شجرۂ نسب، اپنے اجداد کی روداد، ان کی خصوصیات، تعریف وتوصیف کے ساتھ ساتھ اس عہد کے تاریخی واقعات نیز ۱۸۵۷ء میں اودھ کی حالت ابتر کے ساتھ ساتھ اپنے حالات زندگی بھی رقم کیے ہیں۔

بوستان ہند: مہرؔ کی یہ تصنیف اودھ کی تاریخ پر مشتمل ہے، اودھ پر لکھی گئی تواریخ میں اس کا ایک اہم مقام ہے، یہ تصنیف چھ دفتروں پر محیط ہے:

۱-دفتر اول: شاہان ہنود۔ مصنف نے اس دفتر میں خطۂ اودھ کے ہندو راجاؤں کا ذکر کیا، اودھ کی وجہ تسمیہ کا ذکر بھی بڑے محققانہ انداز میں کیا ہے، مہاراجہ رام چندر اور ان کے جانشینوں کے ذکر کے ساتھ دیگر امراء اور واقعات کا ذکر کیا گیا ہے۔

۲-دفتر دوم: وزرای شاہان دہلی۔ اس باب میں سلطنت دہلی کی طرف سے تعینات کیے گئے وزراء، دار السلطنت فیض آباد، مدار السلطنت لکھنؤ، وزراء کو پیش آئی بغاوتوں اور ان کو فرو کرنے کے تاریخی واقعات بیان کیے گئے ہیں۔

۳-دفتر سوم: شاہان اودھ۔ مصنف نے اس دفتر میں سلطنت دہلی کی خستہ حالت کے بعد

اودھ میں برسر اقتدار خودمختار حکومت، یہاں کے فرماں روا، ان کے وزراء اور ان کے عہد کے مشہور شعراء کا ذکر بھی ضمناً کیا ہے جو بہت معلوماتی ہے۔

۴- دفتر چہارم: دورۂ غدر۔ اس باب میں مصنف نے غدر کے حالات اور اہم واقعات بیان کیے ہیں۔

۵- دفتر پنجم: ذکر اجداد مولف۔ اس دفتر میں مصنف نے اپنے اجداد کا ذکر کیا ہے۔

۶- دفتر ششم: ذکر سندیلہ و معاریف آن۔ مصنف نے اس دفتر میں سندیلہ کی وجہ تسمیہ اور یہاں کے علماء، فضلاء، شعراء اور صوفیہ کا ذکر کیا ہے۔

تاریخ سندیلہ: مصنف نے اس تصنیف کا نام تو تاریخ سندیلہ رکھا ہے مگر اس میں سندیلہ کی تاریخ سے متعلق زیادہ مواد نہیں، بجائے اس کے مصنف نے اپنے آباء و اجداد کا ذکر کیا ہے، شروع میں سندیلہ کی وجہ تسمیہ اور تاریخ سے متعلق چند اوراق رقم کیے ہیں جو بڑے گنجلک معلوم ہوتے ہیں اور آخر کے چند اوراق میں قصبے کے دیگر روساء، صوفیہ اور نامور خاندانوں کا ذکر بڑے اختصار کے ساتھ کیا ہے، تاریخ سندیلہ کے بارے میں جناب شکیل احمد صدیقی لکھتے ہیں:

> ''مقام افسوس ہے کہ قصبے کی کوئی باقاعدہ تاریخ اب تک شائع نہ ہوسکی، یوں تو کئی حضرات نے تاریخ لکھی ہے لیکن زیور طبع سے جو کتاب آراستہ ہوئی وہ راجہ درگا پرساد کی تصنیف ''تواریخ سندیلہ'' ہے، یہ ۱۹۱۵ء میں کارونیشن پریس لکھنؤ سے طبع ہوئی تھی، اس تاریخ کے بارے میں عام خیال ہے کہ اس قصبے کی تاریخ کے بجائے خود راجہ درگا پرساد کے اپنے خاندان کی تاریخ ہے، ۳۱۵ صفحات کی اس تاریخ میں ۲۰۶ صفحات میں راجہ صاحب نے اپنے خاندان کا حال لکھا ہے، بقیہ ۱۰۹ صفحات میں پورے قصبے کے تمام خاندانوں کا حال انتہائی مجمل طور پر لکھا ہے، جس میں بعض خاندان صرف پانچ سطروں سے زیادہ جگہ نہ پاسکے''۔(۶)

حدیقۂ عشرت: درگا پرساد مہر کی یہ تصنیف ''حدیقۂ عشرت'' فارسی زبان کی شاعرات کا تذکرہ ہے، جس میں تقریباً ۱۰۰ متقدمین و متاخرین شاعرات کا ذکر کیا گیا ہے، تذکرہ کو الف بائی ترتیب پر لکھا گیا ہے، جس کی شروعات آقائی سے ہوتی ہے اور اس کا اختتام ہمدمی پر ہوتا ہے،

تذکرہ کی ابتداء اس شعر سے ہوتی ہے:

ای شاہد زیبای سخن جلوہ گری کن　　از شوخی خود کلک مرا بال و پری کن(۷)

مولف نے کتاب کے مقدمہ میں شاعرات کی شاعری سے متعلق لکھا ہے اور ان کا خیال ہے کہ دلا رام جو کہ بہرام گور کی معشوقہ تھی، فارسی کی پہلی شاعرہ ہے، تذکرے میں مولف نے اکثر شاعرات کا حال بہت مختصر لکھا ہے اور بہت کم ہی ایسی شاعرہ ہیں جن کا ذکر مولف نے مفصل کیا ہے مثلاً آفاق جلایرو آرام و جہان خاتون و زیب النساء وغیرہ۔ یہ تصنیف کوین پریس سندیلہ سے ۱۸۹۴ء میں شائع ہوئی۔

تاریخ اجودھیا: مہرؔ سندیلوی نے اجودھیا کی تاریخ بھی لکھی اور اپنے اس شاہکار سے اپنا مقام صف اول کے مورخوں میں درج کروالیا، مہرؔ کی یہ تصنیف بھی نثر میں ہے اور اس میں جو منظوم اقتباسات درج کیے ہیں وہ مسیح پانی پتی کی منظوم رامائن سے لیے ہیں، حالانکہ وہ خود ایک بلند پایہ شاعر تھے، چاہتے تو خود نظم کر سکتے تھے مگر انہوں نے ایسا نہ کیا، تاریخ اجودھیا کی اولیت کے بارے میں جناب سبط محمد نقوی صاحب لکھتے ہیں:

> ''...... ہندی میں اودھ داسی جی سے پہلے کسی نے اس موضوع پر اتنا تفصیلی کام نہیں کیا تھا۔ معلوم ہے کہ اودھ داسی جی کی اس موضوع پر پہلی تقریر ۱۹۲۰ء کے پاس کی ہے۔ مہرؔ کی کتاب ۱۹۰۲ء میں شائع ہو چکی تھی''۔(۸)

شعری کارنامہ: مہرؔ سندیلوی کا شمار اپنے زمانہ میں اودھ کے صف اول کے شعراء میں ہوتا تھا، ان کی شاعری کا بیشتر حصہ قصائد، مثنویات اور قطعات پر مشتمل ہے اور ان کے مجموعات شائع بھی ہو چکے ہیں مگر اب فارسی کی زبوں حالی کے سبب کم یاب ہیں، ان مجموعات میں ''مثنوی مہر تاباں''، ''مثنوی مہر الفت''، ''پند دل پسند'' اور ''قصائد مہر'' شامل ہیں، مہرؔ کی شاعری کے بارے میں ڈاکٹر شکیل احمد صدیقی لکھتے ہیں:

> ''.....مورخ سے بڑھ کر ان کی حیثیت شاعر کی ہے، ان کی شاعری اس قصبے کے لیے باعث فخر ہے، انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں اس ملک کے فارسی گو شعراء میں ان کا شمار صف اول میں کرنا چاہیے، ان دو صدیوں میں فارسی کے ایسے بلند پایہ شاعر کم

ہی ہوئے ہیں۔ان کی فارسی دانی کو ایرانیوں تک نے سراہا ہے، چنانچہ ذکاء الملک وزیرصیغہ علمی سلطنت ایران نے ان کی کتاب ''گلستان ہند'' پر ریویو کے سلسلے میں لکھا تھا کہ ''بلندی مقام آن بخت یار را در دانستن فارسی معلوم نماید''۔(۹)

مہر کی منظوم تخلیق ''پند دل پسند'' کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب انہوں نے اپنے فرزندوں کو اخلاق کی تعلیم دینے، اپنی تہذیب و ثقافت کی یاد دہانی کرانے اور اپنے معاشرے کے اثرات قبول کرنے کے لیے لکھی تھی، اس بات کا اندازہ ان اشعار سے لگایا جاسکتا ہے جن میں مہر نے اپنے فرزندوں کو ہندوستانی وضع اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہے:

اے پسر دایم بہ وضع خویش باش در طریق خود عقیدت کیش باش
دور کن ازیں لباس دیگراں باش جاں! دایم بوضع خانداں
بہر ہر ملکے لباس دیگر است بس لباس ملک خود نیکو تر است(۱۰)

مہر سندیلوی تین بھائی تھے، سب سے بڑے مہر، کنور کامتا پرشاد نجم اور سب سے چھوٹے جوالا پرشاد، کامتا پرشاد نجم صاحب بھی اہل قلم شخصیت تھے، مہر کی اکثر تصانیف میں ان کے قطعات تاریخ دیکھے جاسکتے ہیں۔مہر اپنے بھائیوں کے بارے میں ''پند دل پسند'' میں لکھتے ہیں:

در جہاں دارم دو اخوان عزیز ہر یکے زاں، مخزن علم و تمیز
اتفاق و الفت ایشاں بمن کرد آں کارے کہ باراں با چمن
اتفاق افزود، اعزازم بسے در جہاں بے نمود ممتازم بسے(۱۱)

مہر سندیلوی کے خاندان کے بارے میں زیادہ معلومات فراہم نہ ہوسکیں یا یوں کہیں کہ شاید مہر کے بعد اس خاندان نے کوئی ایسا فرزند نہ پیدا کیا جو علم کی شمع کو روشن رکھتے ہوئے اپنے عظیم المرتبت والد کی حیات اور خاندان کے حالات قلم بند کرتا، سبط محمد نقوی صاحب لکھتے ہیں:

''مہر نے اپنے سات بیٹوں کا ذکر کیا ہے فرزند اکبر کنور جنگ بہادر کے یہاں بھی ۱۸۹۴ء میں ایک فرزند کی ولادت ہوچکی تھی میرے استفسار پر مشہور سیاسی رہنما بابو تر لوکی سنگھ نے مہر کے دو وارثوں کی نشان دہی کی تھی، یہ صاحبان غالباً ہومیوپیتھی کا مطب کرتے تھے''۔(۱۲)

مہرؔ سندیلوی نے ان معرکۃ الآراء تصانیف کے علاوہ اور بھی کئی تصانیف سپرد قلم کیں مثلاً مخزن اخلاق (۱۳)، گلشن ناز (۱۴)، ارتھ میٹک، جغرافیہ وغیرہ مگر ان کے بارے میں کوئی اطلاع فراہم نہ ہوسکی۔ آخر کار ۱۹۲۰ء میں اس مجمع الکمال، بحر علم و فضل اور کثیر التصانیف شخصیت نے اس جہاں کو خیر باد کہہ دیا۔ (۱۵)

حواشی

(۱) کھیم چند نے ایک بار ایک بڑا یگیہ کر کے نو من سونا برہمنوں کو خیرات کیا تھا تب سے وہ اس لقب سے یاد کیے جانے لگے تھے۔ (۲) پند دل پسند۔ مہرؔ سندیلوی۔ مطبع نول کشور ۱۹۰۳ء۔ ذیلی نوٹ ۳۔۲۲۔ (۳) مہرؔ۔ پند دل پسند، مطبع نول کشور ۱۳۳۱ھ-۱۹۰۳ء۔ ذیلی نوٹ ۲۷۔۲۶۔ (۴) گلستان ہند (دفتر اول)۔ درگا پرساد مہرؔ۔ کوین پریس، سندیلہ، ص ۱۴۔ (۵) گلستان ہند (دفتر سوم)۔ مہرؔ سندیلوی، ص ۴۷۔ (۶) مضمون ''اودھ کا ایک قصبہ سندیلہ''، روزنامہ قومی آواز، مورخہ ۲۳؍دسمبر ۱۹۷۳ء۔ (۷) حدیقۂ عشرت۔ درگا پرساد مہرؔ۔ مطبع دبدبۂ احمدی لکھنؤ، ۱۸۹۸ء۔ ص ۲۔ (۸) اعلام وافکار۔ سبط محمد نقوی۔ نشاط پریس ٹانڈہ فیض آباد ۱۹۸۲ء۔ ص ۴۶۔ (۹) مضمون ''اودھ کا ایک قصبہ سندیلہ''، روزنامہ قومی آواز لکھنؤ، مورخہ ۲۳؍دسمبر ۱۹۷۳ء۔ (۱۰) پند دل پسند۔ مہرؔ سندیلوی، مطبع نول کشور، ۱۹۰۳ء، ص ۴۔۲۲۔ (۱۱) ایضاً ص ۱۹۔ (۱۲) اعلام وافکار۔ سبط محمد نقوی۔ نشاط پریس ٹانڈہ فیض آباد ۱۹۸۲ء۔ ص ۵۱۔ (۱۳، ۱۴) مخزن اخلاق اور گلشن ناز۔ آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے مطبوعہ کتب کے کیٹلاگ میں درج ہیں مگر ان تک رسائی اس لیے نہ ہوسکی کیونکہ وہاں کے ذمہ دار حضرات کے ذریعہ یہ اطلاع ملی کہ ان کی تصانیف کا نام کیٹلاگ میں تو موجود ہے مگر یہ الماریوں میں موجود نہیں ہیں۔ (۱۵) نوابی عہد کے ہندوؤں کا فارسی ادب میں یوگدان۔ ڈاکٹر نریندر بہادر سریواستو۔ نامی پریس لکھنؤ ۱۹۷۹ء۔ ص ۱۵۱۔

کتابیات و رسائل

(۱) اعلام وافکار۔ سبط محمد نقوی۔ نشاط پریس ٹانڈہ فیض آباد ۱۹۸۲ء۔ (۲) نوابی عہد کے ہندوؤں کا فارسی ادب میں یوگدان۔ ڈاکٹر نریندر بہادر سریواستو۔ بار اول۔ نامی پریس لکھنؤ ۱۹۷۹ء۔ (۳) گلستان ہند (جلد اول، دوم، سوم، چہارم)۔ کنور درگا پرساد مہرؔ۔ کوین پریس، سندیلہ ۱۸۹۷ء۔ (۴) بوستان اودھ۔ کنور درگا پرساد مہرؔ۔ کوین پریس، سندیلہ۔ (۵) پند دل پسند۔ درگا پرساد مہرؔ۔ مطبع نول کشور ۱۹۰۳ء۔ (۶) حدیقۂ عشرت۔ کنور درگا پرساد مہرؔ۔ مطبع دبدبۂ احمدی محلہ مشک گنج لکھنؤ ۱۸۹۸ء۔ (۷) روزنامہ قومی آواز لکھنؤ۔ مورخہ ۲۳؍دسمبر ۱۹۷۳ء۔

علامہ شبلی نعمانیؒ کا مذہبی نقطہ نظر

جناب خورشید جمال قاسم

علامہ شبلی اس نادرۂ روزگار وجود کا نام ہے جو مشرقی یوپی کے ضلع اعظم گڑھ کی خاک سے اٹھا اور نیر تاباں بن کر علمی دنیا پر چھا گیا، وہ اردو کے بہترین نثر نگار، مایہ ناز فنکار، جدید طرز کے سوانح نگار، مصلح روزگار، معلم اور متکلم اسلام، مورخ و فلسفی، شاعر سخن شناس اور عربی، فارسی اور اردو زبان و ادب کے بہترین اداشناس تھے، علم و ادب کے ساتھ وہ سیاسی بصیرت سے بھی بہرور تھے، اقبال سہیلؔ کو کہنا پڑا ؎

جمع در یک پیکر شبلی جہانے بودہ است یوسف گم گشتہ ما کاروانے بودہ است

علامہ شبلی کے مذہبی پہلو کو دیکھنے کے لیے سب سے پہلے ان کے ماحول پر نظر ڈالنا مفید ہوگا علامہ شبلی کی پیدائش مشرقی اتر پردیش کے ضلع اعظم گڑھ کے بندول نامی ایک گاؤں میں ۳؍جون ۱۸۵۷ء میں ہوئی، والدین دیندار ہی نہیں بلکہ شب زندہ دار بھی تھے، والد محترم حبیب اللہ صاحب نے اپنے دینی رجحان کے مطابق مختلف مدارس میں انہیں تعلیم دلائی لیکن ان کے خاص استاد مولانا فاروق صاحب چریاکوٹی تھے جو مختلف علوم وفنون میں درک رکھنے کے ساتھ ساتھ امام المعقولات بھی تھے، مولانا سے اکتساب فیض کے بعد رامپور جا کر مولانا ارشاد حسین صاحب سے فقہ واصول فقہ کی تعلیم حاصل کی، پھر دیوبند جا کر علم فرائض سیکھا، مزید تعلیم کی تکمیل کے لیے لاہور جا کر وہاں کے اورینٹل کالج کے پروفیسر مولانا فیض الحسن صاحب سے عربی ادب کا درس لیا، جن کی صحبت میں عربی کا ان کا ذوق حد کمال کو پہنچ گیا، قرآن پاک کی فصاحت و بلاغت اور نکتہ شناسی ان ہی سے سیکھی، اس کے بعد سہارن پور جا کر مولانا احمد علی محدث سے حدیث شریف کی تعلیم حاصل کی جو

ریسرچ اسکالر، مہاتما گاندھی کاشی ودیا پیٹھ، وارانسی۔

اس فن کے امام سمجھے جاتے تھے۔ان اہل فضل وکمال کی تعلیم سے علامہ شبلی کو علوم وفنون میں رسوخ حاصل ہوا، مولانا فاروق چریا کوٹی کے اثر سے وہ راسخ العقیدہ حنفی ہوئے ، شروع میں استاد کا اثر اتنا تھا کہ حنفیت میں عصبیت کا ظہور تھا، ملک کے مذہبی وفقہی ماحول کو دیکھتے ہوئے امر فطری بھی نظر آتا ہے کیونکہ اس وقت ملک میں مسلکی مناظروں کا بازار گرم تھا، ایسی حالت میں علامہ شبلی جیسا فرد کیوں کر خاموش بیٹھتا ، غیر مقلدین سے نہ صرف یہ کہ مناظرے کیے بلکہ کتابیں بھی تصنیف کیں۔علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

> ''واقعہ یہ ہے کہ علامہ ابتداء میں سخت حنفی تھے اور حنفی کہلانا اپنے لیے موجب فخر سمجھتے تھے اور طبیعت جدت پسند تھی ، اس لیے بجائے حنفی کہنے کے اپنے آپ کو نعمانی کہا، حالانکہ یہ نسبت انہوں نے خود سے اختیار نہیں کی ، ان کے استاد مولانا فاروق صاحب چریا کوٹی نے ان کا لقب ''نعمانی'' رکھ دیا تھا''۔
> (بحوالہ حیات شبلی)

شبلی کا ایک وصف ان کی عقلیت پسندی ہے، کلام اور علم الکلام سے ان کا رنگ جس طرح نمایاں ہے اس کے لیے دلیل کی بھی ضرورت نہیں، واقعہ یہ ہے کہ وہ ہر مسئلہ کو عقل کی کسوٹی پر کستے ، علل وحکم کی ترتیب قائم کرتے لیکن یہ عقلیت پسندی بے محابا نہ تھی ، بلکہ اس کی بھی ان کے نزدیک ایک حد مقرر تھی ، یہی وجہ ہے کہ تفسیر وعقائد کی بعض چیزوں میں سرسید کی عقلیت پسندی کو انہوں نے کلیۃً قبول نہیں کیا۔علامہ سید سلیمان ندوی رقم طراز ہیں:

> ''علامہ عقائد و خیالات کے لحاظ سے عقلیت پسند تھے لیکن ان کی عقلیت پسندی کے معنی یہ ہیں کہ وہ احکام مذہبی کو مصالح وحکم پر مبنی سمجھتے تھے، اسی لیے وہ احکام الٰہی کی مصلحتوں کی تلاش میں رہتے تھے اور اشاعرہ کے اس خیال کے کہ احکام الٰہی کا منشا محض مشیت الٰہی ہے اور وہ کسی مصلحت اور حکمت پر مبنی نہیں سخت مخالف تھے، اس بنا پر لوگ سمجھتے تھے کہ وہ معجزات کے بھی قائل نہ ہوں گے، کیونکہ وہ خرق عادت پر مبنی اور خلاف عقل ہوتے ہیں، یہ سوءِ ظن قطعاً غلط ہے، وہ معجزات کے قائل تھے اور سرسید وغیرہ کی تاویلات کو دور از کار اور ملمع سمجھتے تھے''۔

سنی و حنفی اور صحیح العقیدہ ہونے کے لیے ان کی مندرجہ ذیل تحریر حرف آخر قرار دی جاسکتی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''نبوت کے متعلق میرا ہرگز یہ اعتقاد نہیں ہے کہ وہ اکتسابی ہے اور ہر شخص نبی ہوسکتا ہے، میں نبوت کو عطیۂ الٰہی سمجھتا ہوں اور آنحضرتؐ کو خاتم الانبیاء یقین کرتا ہوں اور جو شخص اس بات کا قائل ہو کہ آنحضرتؐ کے بعد بھی کوئی نبی ہوسکتا ہے، اس کو مسلمان نہیں مانتا، باقی میرے عقائد وہی ہیں جو قرآن شریف اور حدیث سے ثابت ہیں، میں عقیدتاً اور فقہاً دونوں لحاظ سے اہل سنت و جماعت سے ہوں''۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کے بقول اس اعلان میں آخری سطریں یوں ہی چھپی ہوئی ہیں مگر چونکہ میں اس واقعہ کے وقت حاضر تھا، جیسا کہ میں نے پہلے بھی لکھا ہے، اس لیے مجھے علم ہے کہ اصل میں پہلے جو کچھ مولانا نے لکھا تھا، اس کی اخیر سطریں انہوں نے یہ لکھی تھیں جو ان کے ہاتھ سے لکھی ہوئی اب تک میرے پاس ہیں ''باقی میرے عقائد وہی ہیں جو حضرات حنفیہ کے عقائد ہیں، میں عقائد اسلام اور مسائل فقہیہ دونوں میں حنفی ہوں''۔ (بحوالہ شبلی ۶۲۶)

شبلی عملی اعتبار سے بھی ایک پکے مسلمان تھے، علی الصباح پابندی کے ساتھ قرآن حکیم کی تلاوت فرماتے تھے، دین کے اور دوسرے احکام پر سختی کے ساتھ عمل پیرا رہ کر دوسروں کو بھی سختی سے پابندی کراتے تھے، فریضۂ حج کو طالب علمی کے زمانے میں ہی ادا کر چکے تھے، سرسید کے ساتھ ایک بار نینی تال گئے تو سفر میں بھی پابندی کے ساتھ روزہ رکھا، حادثۂ پا کے بعد گو کہ معذوری ہوگئی تھی لیکن اس حال میں بھی ڈولی کے ذریعہ مسجد جانے کا اہتمام کرتے، شادیوں میں رسم و رواج بہت عام ہیں، انہوں نے ان کی جڑیں بھی کاٹیں خود اپنے صاحبزادے کی شادی میں ایک پر اثر تقریر فرمائی، جس کا بے حد اثر ہوا، اپنی برادری میں شادی کا ایک خاص ضابطہ مقرر فرمایا جس پر کسی نہ کسی حد تک آج بھی عمل برقرار ہے، ایک مرتبہ ایک عزیز کی شادی کی تقریب میں لوگوں نے رقص و سرود کا سامان کیا، ان کو معلوم ہوا تو سخت خفگی ظاہر فرمائی اور شرکت سے انکار کر دیا، آخر جب لوگ اس حرکت سے باز آئے تب انہوں نے شرکت فرمائی۔

علامہ شبلی نے نہ صرف انگریزوں کا زمانہ پایا بلکہ انگریزی تعلیم کے گڑھ علی گڑھ کالج میں سولہ سال ۱۸۸۳-۱۸۹۸ء تک بغیر کسی ادنی مرعوبیت کے نہ صرف یہ کہ اپنی مذہبی شناخت و شان پر قائم ودائم رہے بلکہ درس قرآن، لجنۃ الصلوۃ اور دوسرے بہت سے عنوانات کے ذریعہ علم وادب کے دریا بہائے اور پورے کالج میں ایک دینی وانقلابی روح پھونک دی، قائد حریت مولانا محمد علی جوہر کا بیان ہے کہ میرا قرآن پاک کا پاکیزہ ذوق ان ہی کا دیا ہوا ہے، وہ مزید فرماتے ہیں کہ مولانا شبلی نے ہمیشہ اسلام اور اسلامی شعائر کو طلبہ کے سامنے ایک زندہ حقیقت اور موثر طاقت کی حیثیت سے پیش کیا اور اس طرح سے ایک مسلم کالج کو عملاً ایک مسلم کالج میں تبدیل کرنے کی اپنی بھرپور کوششیں صرف کیں، اگر یہ خیال کہیں ہے کہ سرسید اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ انگریزیت کے حوالے سے انتہاپسندی کی طرف جارہے تھے تو علامہ نے ان کے سامنے ایک زبردست بند باندھا اور مذہبی روح کے ذریعہ ان میں اعتدال وتوازن پیدا کر کے علی گڑھ کو صحیح سمت سفر دے کر انہوں نے ایک بڑا قابل قدر کام انجام دیا، یہ تمام باتیں اس بات کی بین دلیل ہیں کہ مولانا عقائد ونظریات سے ہی صرف ایک صحیح العقیدہ مسلمان نہ تھے بلکہ ان کو عملی پیکر دیتے ہوئے دوسروں میں بھی روح اسلامی اور دینی بیداری پیدا کرنے کا انہوں نے کوئی دقیقہ اٹھانہیں رکھا اور ان کی زندگی کا ہمیشہ یہ اولین مقصد رہا۔ جہاں تک ان کی قلمی کاوشوں کا تعلق ہے تو وہ ایک ہفت اقلیم ہے جس کو میں یہاں چھیڑنا نہیں چاہتا تاہم اتنی بات عرض کرنے میں کوئی حرج نہیں کہ حضرۃ العلام نے اپنی تمام قلمی کاوشوں اور علمی نثری وشعری صلاحیتوں کو اسلام کی ہمہ جہت خدمتوں میں انتہائی طور پر صرف کیا، خصوصاً اسلام اور تاریخ وتمدن اور مشاہیر اسلام سے متعلق مستشرقین اور دیگر مصنّفین کی غلط بیانیوں اور افترا پردازیوں کا پردہ چاک کرنے اور اسلامی تاریخ وتمدن کے مختلف پہلوؤں پر اپنی عالمانہ اور محققانہ نگارشات پیش کر کے ایک تاریخ رقم کی اور یہی نہیں بلکہ خارجی حملوں کے ساتھ ساتھ داخلی کمزوریوں اور کوتاہیوں پر بھی مولانا کی نظریں جمی رہتی تھیں، وہ خوب جانتے تھے کہ بدعات کی ایک دنیا ہے جو اسلام کی بنیاد کو کمزور کررہی ہے اور اس طرح سے خارجی دشمنوں کے ساتھ ساتھ داخلی نادان دوست بھی اسلام کی شبیہ کو بگاڑنے پر آمادہ ہیں، ''الفاروقؓ'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں ''اسلام نے شرک کو کس زور وشور سے مٹایا لیکن

غور سے دیکھوتو قبروں اور مزاروں کے ساتھ عوام ایک طرف، خواص کا جو طرز عمل ہے اس میں اب بھی کس قدر شرک کا مخفی اثر موجود ہے، گو استفادہ عن القبور اور حصول برکت کے خوش نما الفاظ نے ان پر پردہ ڈال رکھا ہے''، مولانا کی ایسی دوراندیشی اور دین متین کی خدمت کی تڑپ دیکھتے ہوئے زباں پر بے ساختہ یہ شعر آجاتا ہے

نگہ بلند سخن دل نواز جاں پرسوز یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لیے

علامہ شبلی کی ساری زندگی اوران کی تمام کاوشیں ان کی مذہبی غیرت وحمیت کی وہ زندہ مثالیں ہیں جنہوں نے اسلامی نشاۃ ثانیہ کی روح پھونکنے میں انتہائی وقیع کردار ادا کیا اور تا قیامِ قیامت انشاء اللہ قندیل راہ بنی رہیں گی۔ اب حرف آخر کے طور پر راقم الحروف یہ عرض کرتا ہے کہ محمد عربیؐ صرف مذہب اسلام کی نہیں بلکہ سارے عالم کی جان ہیں اور آپؐ سے محبت ہمارا ایمان ہے، علامہ شبلی کو بھی اس ذات اقدس سے بے پناہ محبت وشیفتگی تھی اور اگر بے ادبی نہ ہوتو کہا جاسکتا ہے کہ اگر شاہ جہاں نے ایک محبوب مجازی کی یاد میں تاج محل جیسا عجوبہ روزگار چھوڑا تو شبلی نے اپنے محبوب نبیؐ کی سچی محبت وشیفتگی کی ایک نادرۂ روزگار اور لازوال یادگار سیرت النبیؐ چھوڑی، اخیر وقت میں وہ بالکل نزار ونا تواں ہوگئے تھے اور ڈاکٹر کے بقول صرف ان کا دماغ کام کررہا تھا، احقر سمجھتا ہے کہ دماغ کو حکم الٰہی نے صرف اس لیے روک رکھا تھا کہ وہ اپنی حاصل زندگی اور روح زندگی یعنی سیرت النبیؐ (جو ادھوری تھی) کے بارے میں وصیت کرسکیں اور یہ کہ ایک محبوب کے تعلق سے دوسرے محبوب کا خواب کہیں ادھورا اور ناتمام نہ رہ جائے، انہوں نے اپنے عزیز شاگرد مولانا سید سلیمان ندوی کو یاد فرمایا اور زبان مبارک سے تین مرتبہ کہا سیرت، سیرت، سیرت اور پھر انگلی سے لکھنے کا اشارہ کرکے کہا، سب کام چھوڑ کے، اور اس طرح جاتے جاتے پوری دنیا کو اپنی زندگی کے نچوڑ کے طور پر وہ ایک لازوال پیغام دے گئے کہ دیکھو اپنے نبیؐ کی سنتوں کو سینے سے لگائے رکھنا اور اسی کو مجموعۂ ضروریاتِ دینی ودنیوی سمجھتے رہنا۔

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتم خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

''سیرت نگاری میں مسلم امت کی خدمات''

مراکش کے ایک اہم سیرت سمینار کی روداد

ڈاکٹر صاحب عالم اعظمی ندوی

مقدمہ: الحمدللہ میری یہ خوش نصیبی ہے کہ مجھے مراکش کے مشہور تاریخی شہر فاس میں واقع مجلس تحقیقات و دراسات علمیہ (مبدع) کے زیر اہتمام سیرت کے حوالے سے منعقد سہ روزہ کانفرنس میں شرکت کا موقع ملا۔اس کانفرنس میں دنیا کے مختلف ممالک سے علماء اور ریسرچ اسکالرز نے شرکت کی،جس میں مقامی مراکشی مقالہ نگاروں کے علاوہ سعودی عرب،اردن،قطر،کویت، امارات،مصر،تونس،جزائر،موریتانیا،ترکیا،ناروے،ہندوستان اور مراکش کے علماء شامل ہیں۔ جنہوں نے سیرت نبوی کے حوالے سے اپنے تحقیقاتی مقالات اور منصوبوں کو پیش کیا۔

شہر فاس مراکش کا تیسرا بڑا شہر ہے،جو تین حصوں پر مشتمل ہے،فاس البالی (قدیم شہر)، فاس جدید (نیا فاس) اور ولےنوالے (فرانسیسی تعمیر شدہ شہر کا جدید حصہ)،قدیم شہر میں دنیا کی دوسری سب سے قدیم مسجد (جامع قرویین) ہے جو مصر کی مسجد جامع عمرو بن العاصؓ کے بعد بنائی گئی۔قدیم شہر عجیب ہے،ایسی گلیاں ہیں جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھیں۔آج یہ سیاحت کا بہت بڑا مرکز بن چکا ہے۔ایک چیز یہ دیکھنے میں آئی کہ اس شہر میں گاڑیوں کی آمد و رفت بالکل ممنوع ہے،شہر میں داخلے کے لیے متعدد بڑے دروازے ہیں جن سے پیادہ پا ہی داخل ہوا جا سکتا ہے۔شہر قدیم ہونے کے بعد بھی اس میں صفائی کا بہت ہی خاص خیال رکھا جاتا ہے۔شہر کے مشہور دروازوں کے نام باب الفتوح، باب الخوخۃ،باب المحروق،باب الحدید،باب الدکاکین،باب المکینۃ،باب ابی الجنود،باب البرجۃ، باب السمارین،باب جبالۃ،باب الکیسۃ،باب سیدی بوجیدۃ،باب شمس،باب زیات ہیں۔

شہر کی بنیاد ادریسی حکومت کے بانی ادریس اول نے ۱۷۲ھ/۷۸۹ء میں رکھی۔۱۹۴ھ/۸۱۰ء میں ادریس دوئم نے افریقہ کی سب سے قدیم اور بڑی مسجد تعمیر کی،اس سے ملحق جامعہ ۲۴۵ھ/۸۵۹ء

باحث کلیہ جامعہ قاہرہ،مصر۔

میں تعمیر کی گئی۔شمالی افریقہ اور مشرق وسطیٰ سے آنے والے مسلمانوں اور سقوط غرناطہ کے بعد اندلس سے بے دخل کیے گئے مسلمانوں سے یہ شہر آباد ہوا۔ان کے علاوہ یہودیوں کی آبادی بھی تھی۔۵۶۵ھ/۱۱۷۰ء سے ۵۷۵ھ/۱۱۸۰ء کے عشرہ میں فاس دنیا کا سب سے بڑا شہر سمجھا جاتا تھا اور یہ اس وقت کی بادشاہت کا دارالحکومت تھا جو موجودہ مراکش، الجزائر اور اندلس کے ان حصوں پر مشتمل تھی جو مسلمانوں کے زیر حکومت رہے۔فاس سائنسی اور مذہبی علوم کا مرکز قرار پایا جہاں یورپ اور دوسرے علاقوں سے مسلمان اور عیسائی علم حاصل کرنے کے لیے آتے تھے۔۹۵۴ھ/۱۵۴۸ء میں فاس مراکشی حکومت کا حصہ بنا۔اندلس کے مخصوص تمدن کی یہاں چھاپ نظر آتی ہے۔یہاں کے مسلمانوں نے اندلس سے ملے تمدنی ورثہ کو کافی حد تک سنبھال کر رکھا۔گھروں میں وہی طرز رہائش اور کھانے پینے کے انداز نیز مہمانوں کی ضیافت ہے جو خاص عربی اندلسی روایات کا حصہ ہے۔جدید گھروں میں بھی یہ لوگ اندلسی طرز پر پچی کاری اور تزئین کاری کا خاص خیال رکھتے ہیں۔گھروں میں مہمان خانے کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔کئی گھروں میں جانے کا اتفاق ہوا اور ہر جگہ مہمان نوازی کا خاص انداز دیکھنے کو ملا۔مہمان خانے میں ہر چیز نئی نظر آئی، معلوم ہوا کہ مہمان خانوں کو گھر کی کسی بھی ضرورت کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا ہے بلکہ یہ صرف مہمانوں کے لیے ہوتا ہے اور ضرورت پوری ہونے پر بند رکھا جاتا ہے۔کھانوں کے مختلف اقسام ہیں جو زیتون کے تیل سے تیار کیے جاتے ہیں، زیتون کے باغات ہر جگہ موجود ہیں یہاں کی زمین زرخیز اور زراعتی ہے۔سرسبزی اور شادابی کے ساتھ ساتھ کشمیر کی برف باری اور حجاز کے صحرائی مناظر بھی ہیں۔

مجلس تحقیقات ودراسات علمیہ (مبدع) ایک نظر میں: اس مایہ ناز علمی وتحقیقی ادارہ کا شمار مراکش کی اہم علمی اکیڈمیوں میں ہوتا ہے، یہ اسلامی علوم وفنون میں گراں قدر خدمات انجام دے رہا ہے۔اس کی بنیاد شیخ شاہد بوشیخی نے مراکش کے قدیم تاریخی شہر فاس میں ۱۴۲۸ھ/۲۰۰۷ء میں رکھی۔ اس کے اہم مقاصد میں مختلف اسلامی علوم وفنون میں جدید علمی تحقیقات شائع کرنا ہے۔ یہ مختلف شعبوں کے ساتھ ایک سہ ماہی علمی رسالہ بھی شائع کرتا ہے جس میں مراکش اور عرب دنیا کی ممتاز علمی شخصیات کے رشحات قلم باقاعدگی کے ساتھ شائع ہوتے ہیں۔ یہ سالانہ علمی کانفرنسیں بھی منعقد کرتا ہے۔قرآن وحدیث کے مصطلحات پر ایک مخصوص منصوبہ پر بھی کام کر رہا ہے۔شیخ دکتور شاہد بن محمد بوشیخی کا شمار مراکش کے چیدہ علماء ومفکرین میں ہوتا ہے۔ یہ بہت متواضع، خلیق اور علمی کمالات کے

جامع ہیں۔انہوں نے عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق اسلامیات خصوصاً تدبرقرآن کے موضوع پر متعدد مقالے اور کتابیں لکھی ہیں۔وہ مفسر،انشاپرداز مفکر وداعی کے ساتھ مرشد ومربی بھی ہیں۔ ان کی کتابوں میں ''**نظرات فی المصطلح والمنہج ، نحو معجم تاریخی للمصطلحات القرآنیہ المعرفة ، القرآن الکریم طبیعة و وظیفة ، الھدایة الی بلوغ النھایة ، مصطلحات نقدیة و بلاغیة فی کتاب البیان والتبیین للجاحظ** اور **مصطلحات النقد العربی لدی الشعراء الجاھلیین والاسلامیین : قضایا و نماذج**'' قابل ذکر ہیں۔

کانفرنس کے دوران ان سے کئی ملاقاتیں رہیں لیکن مفصل ملاقات گھر پر ہوئی۔آخری دن دوپہر کے کھانے کے بعد ان کے ساتھ گفتگو کا یہ موقع ملا، چونکہ ندوہ اور مولانا علی میاںؒ سے ان کے پرانے تعلقات ہیں،لہٰذا دیر تک ندوہ کی روداد سنی اور دوسرے علمی مراکز اور ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی حالات پر بھی بات چیت ہوئی۔مولانا علی میاںؒ جب ۱۹۷۶ء میں مراکش گئے تھے تو وہاں مختلف شہروں اور قصبات میں علمی پروگرام ہوئے تھے جن کی روداد مولانا نے اپنی کتاب ''**اسبوعان فی المغرب الاقصی**'' میں تفصیل سے درج کی ہے۔شیخ نے مجھے بتایا کہ مولانا کے پورے سفر میں وہ ہر جگہ مولانا کے ساتھ تھے اور انہوں نے یہ بتایا کہ مولانا نے اپنی اس کتاب میں جابجا ایک شخص کا تذکرہ کیا ہے وہ دراصل میں ہی ہوں۔بعد مکانی کی وجہ سے مراکش کے ہندوستان کے علمی مراکز سے ثقافتی تعلقات کم ہیں مگر یہاں کے علماء میں تعلقات استوار کرنے کی تڑپ دیکھی۔شیخ نے مولانا حمیدالدین فراہیؒ کی خدمات قرآنی کے متعلق اپنے شوق کا اظہار کرتے ہوئے ان کی تالیفات کی فرمائش کی،انشاءاللہ اس کی تعمیل جلد سے جلد کی جائے گی۔

کانفرنس کے مقاصد: اس کانفرنس کا اصل مقصد سیرت نگاروں اور ان کی کتابوں کا جامع تعارف پیش کرنا ہے،تاکہ آئندہ ایک جامع منصوبہ بنایا جاسکے اور سیرت کے قدیم مآخذ کے جدید تحقیقی مطالعہ اور نئے موضوعات کی تلاش کی راہ ہموار ہوسکے اور پوری دنیا کے کتب خانوں میں موجود مخطوطات سیرت کا حصول ممکن بناکر تحقیق وتنقید کے ساتھ ان کی اشاعت عمل میں آسکے۔کانفرنس کا مقصد مختلف علوم وفنون کے ماہر علماء اور اسکالرز کو ایک مرکز پر جمع کرکے باہم علمی وتحقیقی میدان میں تعاون کی صورت پیدا کرنا بھی تھا۔

کانفرنس کا پہلا موضوع، سیرت نگاری میں امت کی خدمات کے عنوان سے تھا اس کے تحت درج ذیل مقالات پیش کیے گئے:

(۱) سیرت نبویؐ کی تدوین میں اوائل علماء کی خدمات، کوششیں ابن اسحاق تک، ڈاکٹر محمد المختار ولد باہ، جامعہ نواکشوط، موریطانیہ۔ (۲) سیرت نبویؐ شریف کی تدوین میں محدثین کی خدمات، ڈاکٹر الحسین ایت سعید، کلیہ آداب، مراکش۔ (۳) سیرت نبویؐ کی تدوین میں مورخین کی خدمات، ڈاکٹر عاشوری قمعون، الجزائر۔ (۴) سیرت نبویؐ کی تدوین میں اصحاب کتب طبقات کی خدمات، ڈاکٹر محمد السرار، فاس مراکش۔ (۵) سیرت نگاری میں صحت واستناد کے حوالے سے محدثین کا کردار: قضایا اور مثالیں، ڈاکٹر ادریس الخرشافی، فاس مراکش۔ (۶) سیرت نبویؐ کی تدوین میں اصحاب طبقات کی خدمات: منتخب مثالوں کی تحقیق، ڈاکٹر الدائز الفریاطی، مراکش۔

دوسرا موضوع ''سیرت نبویؐ کی شرح وتبسیط میں امت کی خدمات'' تھا جس کے تحت درج ذیل مقالات پیش کیے گئے:

(۱) سیرت نبویؐ کی شرح وتبسیط میں علماء کی خدمات، ڈاکٹر مصطفیٰ الیعقوبی، وجدہ، مراکش۔ (۲) سیرت نبویؐ کی منظم تصنیف کاری میں علماء کی خدمات، ڈاکٹر محمد الصقلی الحسینی، فاس مراکش۔ (۳) مختصر، مستقل اور انفرادی سیرت نگاری میں مورخین کی خدمات، ڈاکٹر صالح محمد زکی اللہی، امارات عربیہ متحدہ۔ (۴) سیرت نبویؐ کی وصفی فہرست کاری میں تحقیقی انسائیکلو پیڈیا کا کردار، محمد یسری ابراہیم، مصر۔

تیسرے موضوع فقہ سیرت نبویؐ میں امت کی خدمات کے تحت درج ذیل مقالات پیش کیے گئے:

(۱) سیرت نبویؐ کے ذریعہ شرعی احکام کی تشریح میں علماء کی خدمات، ڈاکٹر محمد جمیل مبارک، اکادیر، مراکش۔ (۲) سیرت نبویؐ میں موجود شرعی احکام کی تشریح میں علماء کی خدمات، احمد بن صالح السراح، ریاض، سعودی عرب۔ (۳) سیرت نبویؐ کے ذریعہ مسائل کے استنباط میں علماء کی خدمات: حضورؐ کے سلوک، ایک مثال، ڈاکٹر بن عمر لخصاصی، مراکش۔ (۴) سیرت نبویؐ کے ذریعہ دعوتی سرگرمیوں کے استنباط میں علماء کی خدمات، ڈاکٹر محمد الینبوعی، مراکش۔ (۵) سیرت نبویؐ کے ذریعہ سیاسی احکام کے استخراج کی مثالیں، ڈاکٹر عبدالسلام بلاجی، مراکش۔ (۶) سیرت نبویؐ کے ذریعہ

سیاسی بصیرت کے حوالے سے علماء کی خدمات، ڈاکٹر سلیمان ولد خسال، الجزائر۔

چوتھے موضوع ''عصر حاضر کی زبان میں سیرت نگاری'' کے تحت درج ذیل مقالات پیش کیے گئے:

(۱) قصوں کی صنف میں سیرت نگاری کے حوالے سے علماء کی خدمات کی چند مثالیں، ڈاکٹر سعد ابوالرضا، مصر۔ (۲) سیرت نبویؐ کی قصہ گوئی میں علماء کی خدمات کا مطالعہ، ڈاکٹر احمد طاہر ابو عمر، اردن۔ (۳) بچوں اور بڑوں کے لیے قصہ کی شکل میں سیرت نگاری، ڈاکٹر محمد عبدالحمید خلیفہ، مصر۔ (۴) نجیب کیلانی کے ادبی ناولوں میں سیرت نبوی کا مقام: قاتل حمزہ ایک مثال، ڈاکٹر حلمی محمد القاعود، مصر۔ (۵) سیرت نگاری میں فلم کا کردار: فلم شیماء ایک مثال، ڈاکٹر عبدالحکیم الزبیدی، امارات عربیہ متحدہ چند اور اہم مقالات کے عنوانات یہ ہیں:

(۱) فرانسیسی زبان میں سیرت نبوی کی کتابوں کی ترجمہ نگاری، ڈاکٹر محمد بریش، قطر۔ (۲) انگریزی زبان میں سیرت نگاری: مولانا وحید الدین خان کی کتاب ''اسلام اور امن واخوت'' ایک مثال، ڈاکٹر محمد بوحمیدی، مراکش۔ (۳) ہسپانوی زبان میں سیرت نبوی کی مترجمہ کتابیں، ڈاکٹر حسن وراکلی، تطوان، مراکش۔

پانچواں موضوع ''سیرت نگاری کی جدید کاوشوں'' کا تھا، اس کے تحت حسب ذیل مقالات سامنے آئے:

(۱) سیرت نبوی کی روایتوں پر جدید محدثین کے مطالعہ، ڈاکٹر المنصف لکریسی، مراکش۔ (۲) سیرت نگاری میں جدید محدثین کی خدمات: کتاب النور الخالد محمد فخر الانسانیہ اور ''محمد رسول اللہ منہج رسالہ'' ایک مثال، ڈاکٹر عمر انور الزبدانی، قطر۔ (۳) سیرت نگاری میں معاصر مورخین کی خدمات، ڈاکٹر محمد موسی الشریف، سعودی عرب۔ (۴) معاصر سیرت کی کتابوں کے ذریعہ جدید دعوتی اسلوب، ڈاکٹر بسیونی نحیلہ، قطر۔ (۵) سیرت نبوی، جدید اسالیب اور مناہج کے ذریعہ مطالعہ کی دعوت، ڈاکٹر احمد عماری، مراکش۔ (٦) سیرت نبوی کے ذریعہ جدید نسل کی تعلیم وتربیت میں علماء کی خدمات، ڈاکٹر عبداللہ الطارقی، سعودی عرب۔ (۷) سیرت نگاری میں ترکی علماء کی خدمات: شیخ فتح اللہ گولن ایک مثال، ڈاکٹر محمد خلیل جیجک، ترکیا۔ (۸) عربی سیرت نگاری میں ہندوستان کے علماء کی خدمات، ڈاکٹر

صاحب عالم اعظمی ندوی، ہندوستان۔

سیرت نگاری میں جدید رجحانات کے موضوع پر کچھ نئے منصوبے بھی پیش کیے گئے، جیسے:

(۱) سیرت نبوی اور اسلامی زندگی: عصر حاضر میں سیرت نگاری کے جدید مناہج و اسالیب، ڈاکٹر عز الدین بن زغیبہ، دبی امارات عربیہ متحدہ۔ (۲) کائناتی اور تمدنی نظام کے تناظر میں سیرت نبوی کا مطالعہ، ڈاکٹر الطیب، برغوث، نرویج۔ (۳) مختلف جہات و ابعاد میں سیرت نبوی کی تعریف: میوزیم السلام علیکم ایہا النبی ایک مثال، ڈاکٹر محمد بن علی الغامدی، سعودی عرب۔ (۴) تاریخی اطلس کے ذریعہ سیرت نگاری، ڈاکٹر فہد بن عبدالعزیز الدامغ، سعودی عرب۔ (۵) سیرت نگاری میں عالمی تعاون فاؤنڈیشن کی خدمات، ڈاکٹر علی عمر بادحدح، سعودی عرب۔

عربی سیرت نگاری میں ہندوستان کے علماء کی خدمات کے عنوان سے راقم نے اپنے مقالہ میں درج ذیل خیالات کا اظہار کیا:

پہلی فصل میں برصغیر میں سیرت نگاری کی ابتداء پر روشنی ڈالتے ہوئے عرب دنیا سے ہندوستان کے تعلقات کا جائزہ لیا گیا کہ کیسے اموی حکومت کے قیام سے پہلے ہی اسلام پرامن طریقے سے ہندوستان میں پھیلنا شروع ہو گیا تھا، سندھ اور دوسرے علاقوں میں عرب علماء نے بودوباش اختیار کر کے ہندوستانیوں کو علم دین سے آراستہ کیا اور اپنے اخلاق عالیہ سے سیاسی، اقتصادی، علمی، ثقافتی اور معاشرتی زندگی میں اہم کردار ادا کیا، نیز سندھ و گجرات میں وارد عرب علماء کی سرپرستی میں ہندوستانی علماء کی ایک بابرکت جماعت تیار ہوئی جس نے ہندوستان بلکہ عرب ملکوں میں بھی حدیث شریف اور سیرت نگاری میں اہم کردار ادا کیا۔ ان عوامل کا بھی تذکرہ کیا گیا، جنھوں نے عربی حکومت کے خاتمہ اور محمود غزنوی اور ان کے اخلاف کی قیادت میں فارسی ثقافت کے ہندوستان میں پھیلنے اور پھولنے میں کلیدی رول ادا کیا تھا۔ مآخذ کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ فارسی ثقافت کی ترویج سیرت نبوی اور حدیث شریف سے بیگانگی کا اصل سبب تھی، جس کی وجہ سے صدیوں تک ہندوستان میں علوم حدیث اور سیرت نبوی پر کماحقہ کام نہ ہوسکا۔

نویں اور دسویں صدی ہجری میں علوم حدیث پر علمائے ہند کی خدمات کے نتیجے میں سیرت نبوی پر خاصا کام ہوا اور اس کی برکت سے متاخرین علماء کو سیرت نگاری میں امتیازی شان نصیب ہوئی، مقالہ کی دوسری فصل میں اسی حقیقت کے جائزے میں علمائے ہند کی کتابوں کا سیرت نبوی، شمائل،

فضائل، مناقب، خصائص، دلائل نبوت اور مدیح نبوی کے اعتبار سے جائزہ لیا گیا ہے۔ ان مخطوطات کی طرف بھی اشارہ کیا جو ہندوستان کے کتب خانوں میں موجود ہیں اور منتظر ہیں کہ تحقیق وتدوین کے بعد ان کی اشاعت عمل میں آئے۔

تیسری فصل میں ہندوستان میں عصر حاضر کے علماء کی سیرت نگاری میں کاوشوں کے جائزہ میں اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں علمائے ہند کی مقامی زبانوں میں سیرت نگاری کا تعارف کرایا گیا، نیز عربی زبان میں بھی ان کی گراں قدر خدمات کا ذکر کیا گیا، بتایا گیا کہ برطانوی استعمار نے اپنے اقتدار وتسلط کے استحکام کے لیے جو حربے اختیار کیے ان میں مستشرقوں اور مشنریوں کے لیے برصغیر میں ہر طرح کی سہولتوں کی فراہمی بھی تھی تا کہ وہ کھل کر اسلام اور اس کے رسولؐ کے خلاف زہر افشانی کریں۔ ان مستشرقین اور مشنریوں کی گستاخیوں کا عملی جواب دینے کے لیے علمائے ہند کی کوششوں کو مختصر مگر جامعیت کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔

اختتامی بیان: کانفرنس کی ان علمی نشستوں کے اختتام پر جو تجاویز سامنے آئیں وہ اس طرح ہیں:

سیرت نگاری میں اعلیٰ علمی اور تحقیقی خدمات کے لیے علماء اور محققین میں باہمی علمی رابطوں کے لیے ایک جامع شکل سامنے لائی جائے اور ہر ملک وخطہ میں سیرت نگاری کے لیے مراکز قائم کیے جائیں۔ خاص سیرت کے علوم ومعارف کی اشاعت کے لیے ٹی وی چینل شروع کیا جائے۔ سیرت نبوی کی ترویج واشاعت کے لیے بین الاقوامی سطح پر انٹرنیٹ صفحہ بنایا جائے جس سے سیرت نبوی سے تعلق رکھنے والے علماء اور محققین کے درمیان تعارف وربط آسان ہو سکے۔ جدید ذرائع ابلاغ مثلاً فلم اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ سیرت نبوی کی اشاعت میں تعاون کی غرض سے بڑی کمپنیوں کے مالی تعاون کے حصول کی کوشش کی جائے۔ مختلف زبانوں میں سیرت نبوی کی خدمت میں مصروف اداروں کا ہر ممکن تعاون کیا جائے۔ سیرت نبوی کے حوالے سے جدید تعلیمی مناہج واسالیب وضع کیے جائیں اور انہیں تعلیمی نصاب میں ہر تعلیمی مرحلہ میں شامل کیا جائے۔ بچوں کے ادب میں سیرت نبوی کو خاص طور پر پیش کیا جائے۔ سیرت کی قدیم کتابوں کی از سر نو تحقیق کی جائے نیز مخطوطات کی تحقیق وتدوین و اشاعت کی جائے۔ سیرت کی معیاری کتابوں کا مختلف زبانوں میں ترجمہ کیا جائے۔ سیرت کی خدمت میں مصروف اداروں کو ہر سال کم از کم ایک سیرت کانفرنس کا اہتمام کرنا چاہیے۔

اخبار علمیہ

''قرآنی مخطوطات کی دریافت''

ترکی کے علاقہ ''ارزورم'' میں کھدائی کے دوران قرآن مجید کے ایسے مخطوطات دریافت ہوئے ہیں جن کا وزن ۳۷ کلوگرام ہے اور کتابت آب زر سے کی گئی ہے، اتا ترک یونیورسٹی کے پروفیسر مخطوطات ڈاکٹر خلدون کا بیان ہے کہ یہ قرآنی مخطوطات پندرہویں صدی عیسوی کے ہیں، کاتبوں کے نام معلوم نہ ہوسکے، یہ بھی صراحت نہیں ہے کہ یہ مخطوطات کاغذ کے ہیں یا پتھر اور لوہے کی سلوں والے ہیں۔ (صراط مستقیم، برمنگھم)

''ملحدین کی تعداد میں اضافہ''

علامہ شبلی نعمانیؒ نے الکلام میں لکھا تھا کہ ''خدا کا انکار کوئی جدید خیال نہیں، ہر زمانہ میں خدا کے وجود کے قطعی منکر یا کم از کم متردد یا متشکک رہے ہیں، سابق وحال کے ملاحدہ میں فرق یہ ہے کہ پہلوں کے دلائل زیادہ دقیق اور پرزور ہوتے تھے، ملاحدۂ حال کے دلائل کو دلائل بھی نہیں کہہ سکتے، ان کے تمام مباحث کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا کا کوئی ثبوت نہیں، اس کے اعتراف کے بغیر نظام عالم کا سلسلہ قائم ہوسکتا ہے اور مادہ ہی سب کچھ ہے، اسی میں ایک تحقیق یہ بھی ہے کہ پندرہویں صدی کے نصف آخر میں اسپین میں مخالف مذہب اور ملحدانہ سرگرمیوں پر نگاہ رکھنے کے لیے مجلس انکویزیشن قائم تھی، جس نے اپنے ابتدائے قیام سے اخیر زمانہ تک تین لاکھ چالیس ہزار آدمیوں کو ملحد قرار دیا تھا جن میں ایک لاکھ سے زیادہ مذہب بیزاروں کو نذر آتش کردیا گیا تھا۔ اس کے باوجود اس گروہ کا خاتمہ نہیں کیا جاسکا، ابھی حال ہی میں واشنگٹن میں قائم پیو فورم ادارے نے عالمی مذہبی رجحانات کے موضوع پر ایک تحقیقی رپورٹ شائع کی ہے، اس میں دنیا بھر کی ڈھائی ہزار مردم شماری رپورٹوں اور مختلف رجسٹروں کو بھی بنیادی مآخذ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے مطابق ۹ء۶ بلین افراد نے مذہبی وابستگی کا اعتراف کیا، مذہب پر یقین نہ

رکھنے والے تیسرے نمبر پر ہیں، چین کے ۷، اور فرانس کے ۳۰ فیصد نوجوان خدا پر بالکل یقین نہیں رکھتے، ۶۸ فیصد امریکی مذہب بیزار ہیں۔ رپورٹ میں اسلام کو سب سے تیز رفتار پھیلنے والا مذہب بتایا گیا ہے، پوری دنیا میں لامذہبوں کی تعداد ۱ء۱ بلین تک پہنچ گئی ہے، ان کی ۶۲ فیصد آبادی صرف چین میں ہے یعنی چین کی ۲ء۵۲ فیصد آبادی غیر مذہبی ہے، جاپان اور امریکہ میں منکرین خدا کی اکثریت ہے۔

''ورلڈ اکانومی کی تازہ رپورٹ میں سعودیہ کی اقتصادیات''

''ورلڈ اکانومی'' کی تازہ رپورٹ میں انکشاف کیا گیا ہے کہ چین کے بعد سعودی عرب کی معیشت سب سے زیادہ تیز رو ہے، ۱۹۹۱ء سے ۲۰۰۸ء تک سعودی عرب امریکا کو ۶۱۲۰/ارب ڈالر قرض دے چکا ہے، خود وہ کسی کا مقروض نہیں ہے، ورلڈ اکانومی کی ۲۰۱۰ء کی جاری کردہ رپورٹ میں سعودی عرب کو دنیا کی اکیسویں اور ترکی کے بعد عالم اسلام کی دوسری بڑی اقتصادی قوت قرار دیا گیا تھا، ۲۰۱۱ء میں اسے بیسویں اقتصادی بڑی قوت تسلیم کیا گیا تھا، رپورٹ میں اس کے اسباب کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ ایران میں تیل کی پیداوار پر یورپی یونین کی پابندی کے سبب سعودی عرب نے زیادہ تیل پیدا کیا اور اس سے اس کو بے پناہ اقتصادی ترقی حاصل ہوئی، دنیا کی متعدد بڑی طاقتیں اس کے اربوں ڈالر کی مقروض ہیں، تیل کے علاوہ حج و عمرہ سے ہونے والی آمدنی بھی اس کا بڑا سبب ہے، اس سے سعودیہ کو ۶۲/ارب ریال کا فائدہ پہنچا، سال رواں میں اس کی اقتصادیات کی شرح نمو ۶ء ۲ فیصد بتائی گئی ہے جو بہت کم کسی ملک کی ہو پاتی ہے۔

''وائبر'' غیر محفوظ مواصلاتی رابطہ کمپنی ہے''

آن لائن ''وکی پیڈیا'' کے مطابق ریڈیو کالنگ، ٹیلی فوننگ اور مختصر پیغامات کی مفت سہولت فراہم کرنے والی میڈیا کمپنی ''وائبر'' کا مرکزی دفتر قبرص میں ہے۔ اس کے مالک ٹالمن مارکو اسرائیل نژاد امریکی اور تل ابیب یونیورسٹی سے کمپیوٹر سائنس اور مینجمنٹ کے سند یافتہ ہیں، یہ اسرائیلی فوج کے صدر دفتر میں شعبۂ اطلاعات کے سربراہ بھی رہے ہیں، وائبر کو سو ملین سے زیادہ

افراد استعمال کررہے ہیں، جن دس ملکوں میں یہ سب سے زیادہ استعمال ہوتا ہے ان میں سات کا تعلق اسلامی بالخصوص مشرق وسطیٰ کے ملکوں سے ہے، اس میں نہ کوئی اشتہار ہوتا اور نہ ہی اس کے کسی پروگرام کو لوڈ کرنے کی فیس ہی لی جاتی ہے، تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ یہ کمپیوٹر کے ذریعہ جاسوسی کرتی ہے اور استعمال کرنے والے کے فون سے اس کے متعلق ہر قسم کے خفیہ معلومات حاصل کرلیتی ہے، اس لیے ماہرین نے دوسرے محفوظ متبادل مواصلاتی رابطہ کو استعمال کرنے کا مشورہ دیا ہے۔

''مسواک میں غیر مرئی جراثیم کو مارنے کی قوت ہے''

یونیورسٹی ایلینوس، شکاگو اور یونیورسٹی ستیلینبوس ٹائیگر برگ، جنوبی افریقہ کے محققین نے اپنی تحقیق میں کہا ہے کہ مسواک میں غیر مرئی جراثیم کو مارنے کے فطری اوصاف پائے جاتے ہیں، اس میں منھ کے امراض کو روکنے کی بھی صلاحیت ہے، دانتوں کے درمیانی شگاف کو کم کرنے اور مسوڑھوں اور دانتوں کے مرض میں بھی یہ مفید ہے، ان کے مطابق دانتوں کی صفائی کے لیے تیسری دنیا کے جن علاقوں میں جدید سہولتیں میسر نہیں ہیں، یہ لکڑیاں بہترین بدل اور قیمتاً ارزاں اور سہل الحصول ہیں، ایلینوس سے وابستہ دانتوں اور مسوڑھوں کی بیماری کے ماہر ڈاکٹر کریسٹن کا کہنا ہے کہ نامبیا میں دانتوں کی صفائی کے لیے جو نباتات (لکڑیاں) استعمال ہوتی ہیں ان کو دیوسبا یروس لایسیویدیس کے نام سے جانا جاتا ہے، ان میں غیر مرئی جرثوموں سے مقابلہ کے چھ اجزا پائے جاتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ لیسٹیرین نامی منجن کی طرح بیکٹیریوں کو مارنے کے لیے یہ کام کرتی ہے، مسواک میں ان جدید مرکبات کے انکشاف سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آنحضورﷺ نے ہر نماز سے قبل مسواک کرنے کی تاکید کیوں فرمائی تھی۔ یہ خبر MaarifaAllah.Tesus.net پر الاستاذ نامی رسالہ میں موجود ہے۔

ک، ص اصلاحی

وفیات

آہ! پروفیسر سید حنیف احمد نقوی مرحوم

گذشتہ دنوں اردو زبان و ادب کو پے در پے اپنے چند ایسے فرزندوں کی جدائی کا صدمہ برداشت کرنا پڑا، جنھوں نے اردو تہذیب و روایت کی بڑے وقار سے پاس داری کی، ۲۲/دسمبر ۲۰۱۲ء کو خبر ملی کہ پروفیسر حنیف نقوی نے اپنے مولد بدایوں کے قصبہ سہسوان میں اس دنیوی زندگی کی آخری سانس لی، ان کا مولد ہی ان کا مدفن بنا، انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔

سہسوان کی سرزمین کو مردم خیز کہا جاتا ہے کہ بعض بڑے ناموراس کی خاک سے اٹھے، سہسوان کی ایک خوبی اس کی مشک بیزی بھی ہے، اس کے کیوڑے کے بارے میں کہا گیا کہ

تازگی بخش مشام جاں ہے کیوڑے کی مہک عطر آگیں ہے نسیم خوش گوار سہسواں

غالباً یہ مٹی کی تاثیر تھی کہ پروفیسر حنیف نقوی کی تحقیق اور ہر تحریر کی جو صفت تسلسل سے محسوس کی گئی وہ یہی مشام جاں کے لیے تازگی بخش خوبی تھی۔

وہ ۱۷/اکتوبر ۱۹۳۶ء میں پیدا ہوئے، علم و ادب کا ماحول گھر اور خاندان سے ملا، جناب مالک رام نے اسی لیے ان کو نجیب الطرفین کہا کہ علم و ادب کا رنگ دادھیال اور نانہیال دونوں جانب سے ان پر خوب کھلا، بدایوں، بھوپال اور بنارس یہ تین بلدے ہیں جو ان کی بلندیوں کی بنیاد بنے یعنی ابتدائی تعلیم بدایوں میں اور ثانوی و اعلیٰ تعلیم بھوپال میں حاصل کی، وہاں کے مشہور حمیدیہ کالج میں گیان چند جین اور ڈاکٹر ابومحمد سحر جیسے مشاہیر سے اکتساب فیض کے نتیجے میں ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی، وہ ذوق جو بدایوں کا قدرتی عطیہ تھا، اس کو بھوپال کی ادبی فضا نے خوبصورت بال و پر عطا کیے، پروفیسر محبوب الرحمٰن، کوثر چاند پوری اور استاذ الشعراء شفا گوالیاری کی توجہات وعنایات کا مرحوم نے بار بار ذکر کیا۔ بھوپال کے بعد ان کا اصل مستقر بنارس کو بننا نصیب ہوا، یہاں وہ ہندو یونیورسٹی میں ۷۰ء میں لکچرر ہوئے اور ۲۰۰۱ء میں پروفیسر اور صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے تدریسی خدمات سے سبکدوش ہوئے، لیکن ان کی علمی و تحقیقی

زندگی میں تادم حیات ایک لمحہ بھی ایسا نہ آیا جب وہ وظیفہ قلم سے وظیفہ یاب ہوئے ہوں۔

انہوں نے تحقیق کی دنیا میں اپنی شناخت جس شان سے قائم کی اس کا اعتراف آخرکار ہوکر رہا، تذکرہ شعرائے اردو کے عنوان سے انہوں نے ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھا، بعد میں یہ مقالہ کتابی شکل میں شائع ہوا، عموماً ایسے تحقیقی مقالے اپنے موضوع پر حرف آخر نہیں شمار کیے جاتے لیکن نقوی مرحوم کا یہ مقالہ شعرائے اردو ہی نہیں نفس تذکرہ نگاری کی تاریخ کے باب میں بہترین مرجع و ماخذ بن گیا، غالباً اسی افادیت کے پیش نظر اس کو بعض یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل کیا گیا، اس کے بعد ان کے تحقیقی مزاج نے خوب سے خوب تر کی منزلوں کو جس طرح سر کیا وہ ان کی تصنیفات و تالیفات کے ناموں اور عنوانوں سے دیکھا جاسکتا ہے، انتخاب کربل کتھا، تلاش و تعارف، انتخاب کلام رجب علی بیگ سرور، رجب علی بیگ سرور چند تحقیقی مباحث، دیوان ناسخ، رائے بینی نرائن دہلوی، میر و مصحفی، تذکرہ شعرائے سہسوان، یہ تمام کتابیں دیکھا جائے تو ان کے تحقیقی مقالے کی توسیع ہیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نقش اول کی کامیاب کوشش کو حاصل سمجھ کر اسی پر وہ قانع نہیں ہوئے، وہ تحقیق کی روشنی میں اور خزانے تلاش کرتے رہے، مضامین نو کے انبار لگاتے رہے، ان کے خرمن کے خوشہ چین بہت رہے، لیکن اعتراف کی زبانوں میں لکنت دور نہ کر سکے لیکن جو حقیقت شناس تھے انہوں نے ان کو سرآمد محقق، پختہ کار اور مہتم بالشان کارناموں کا حامل کہنے میں تامل نہیں کیا، نقوی مرحوم کے تحقیقی تقدس کے لیے ان کی مذکورہ کتابیں کافی ہیں لیکن انہوں نے غالبیات میں غالب آثار و احوال اور مآثر غالب، مرزا غالب کے پنج آہنگ کا قدیم ترین خطی نسخہ، غالب کی چند فارسی تصانیف، غالب کی فارسی مکتوب نگاری جیسی کتابوں کے ذریعہ جس طرح غالب شناسی کے انبار میں انہوں نے جدت کا احساس، اعتبار و استناد کے ساتھ دلایا وہ ان کے غیر معمولی مطالعہ اور اس سے زیادہ ان کی تحقیقی نظر کا شاہد ہے۔

یہ کمال ہی کہا جائے گا کہ ان کے طویل تحقیقی سفر میں کہیں کوئی سستی اور تکان نہیں، ان کے ہر مضمون سے پڑھنے والوں کو نئی باخبری کی لذت ہی ملی، ان کی ایک اور کتاب تحقیق و تدوین مسائل و مباحث کے نام سے ہے، ان کی اکثر کتابوں کی طرح یہ بھی مجموعہ مقالات ہے، تحقیق کے مبادیات، معاصر شہادتیں، استناد، بنیادی نسخوں کا انتخاب وغیرہ موضوعات پر یہ مباحث محققین

اور باحثین کے لیے حددرجہ مفید اور کارآمد ہیں، یہ عملاً خود ان کے تجربات کا نچوڑ ہیں، معارف میں اس کتاب کے ذکر میں کہا گیا تھا کہ ”یہ طلبائے تحقیق کے لیے ناگزیر ہے“۔

نقوی صاحب کی ایک اور خوبی ان کی زبان اور اسلوب ہے، ان کے لہجہ میں ادعائیت کا شائبہ تک نہیں، دوسروں کی گرفت میں ایک دلآویز شائستگی ہے لیکن حقیقت کے اظہار میں کسی مصلحت سے صلح بھی نہیں۔ خاندانی تربیت اور ذاتی اخلاق اور طبعی شرافت کی قلم کی نگہداشت میں جو اہمیت ہے، نقوی مرحوم کی تحریر اس کا بہترین نمونہ ہے۔

شرافت اخلاق کے باب میں ہر وہ شخص گواہ ہے جس نے ان کو دور و قریب سے دیکھا ہے، ہم نے ان کو دور سے دیکھا، کبھی کبھی وہ دارالمصنّفین تشریف لاتے تو مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے پاس نشست ہوتی، گفتگو بھی زیادہ تر ان ہی سے ہوتی، لیکن ہم جیسے چھوٹے ان کی شفقت سے محروم نہ رہتے، مولانا اصلاحی کے انتقال کے بعد ان سے کبھی کبھی فون پر گفتگو ہوتی تو وہ معارف کے لیے اسی شفقت کے جذبے سے مشورے دیتے۔ معارف کے لیے انہوں نے قدسی کی مشہور نعت

ع دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

کی تضمین عنایت فرمائی، مرحبا سید مکی مدنی العربی کے عنوان سے یہ طویل تضمین جب شائع ہوئی تو ہر طرف سے اس کی ایسی تحسین ہوئی کہ حیرت آمیز مسرت ہوئی، میں نے فون پر اطلاع دی تو بڑے نرم لہجے میں اتنا کہا کہ ”دعا ہے یہ بارگاہ رسالت مآبؐ میں بھی قبول کرلی جائے“۔ یقین ہے کہ یہ شرف قبولیت سے سرفراز ہوگی، کیونکہ ہمیشہ حق کی تلاش میں سرگرداں جب یہ کہے کہ

خستہ و خوار و زبوں، زار و نزار و مضطر چاک پیراہن و آشفتہ دل و خاک بہ سر
سارے در چھوڑ کے آیا ہوں در اقدس پر چشم رحمت بکشا، سوئے من انداز نظر
اے قریشی لقبی ، ہاشمی و مطلبی

تو پھر مایوسی و محرومی کی گنجائش ہی کیوں۔

ان کی یہ تضمین یقیناً تاثیر میں بے نظیر ہے لیکن ان کی اور تضمین بھی ان کی قدرت کلام کا نہایت عمدہ اشاریہ ہیں، شاعری ان کے لیے چند لمحوں کی شاید خوش گذاری تھی، غزلیں کہیں لیکن

ان کی تضمینیں کہیں زیادہ ان کی سخن گوئی اور قادرالکلامی کا بیان کرتی نظر آتی ہیں، قدسی کے علاوہ غالب واقبال کے اشعار پر یہ تضمینیں غضب کی ہیں، انہوں نے غالب کی مشہور مثنوی چراغ دیر کا منظوم ترجمہ کیا اور اس شان سے کیا کہ اگر حوالہ نہ ہو تو ایک مصرع بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ طبع زاد نہیں۔

غرض بہت سی خوبیاں تھیں، ان کے ایک عزیز شاگرد سید حسن عباس واقعی خوش نصیب ہیں کہ اپنے استاد کی خدمت میں ان کی زندگی ہی میں نذر حنیف نقوی کے نام سے ارمغان علمی پیش کرنے کی سعادت پائی، دعا ہے کہ ان کو وہاں بھی چاہے جانے کی وہ نعمت ملے جس سے بڑی کوئی نعمت نہیں، رحمه الله رحمة واسعة۔

آہ! پروفیسر کبیر احمد جائسی مرحوم

پروفیسر حنیف نقوی کی وفات کا صدمہ ابھی کم نہ ہوا تھا کہ پروفیسر کبیر احمد جائسی کے انتقال کی خبر آئی، سناٹے جب بڑھنے لگتے ہیں تو وحشت کا سماں کیا ہوتا ہے، ایک بار پھر پوری اردو دنیا اس احساس کی شدت واذیت میں ڈوب گئی، ۷/جنوری ۲۰۱۳ء کو کبیر جائسی صاحب بھی اپنے رب سے جا ملے، انا لله وانا اليه راجعون۔

ایک کا تعلق ہندو یونیورسٹی سے دوسرے کا مسلم یونیورسٹی سے، اس تفاوت کے باوجود دونوں میں عجب یکسانی تھی، علم وادب وشعر کے شہسوار لیکن دونوں نام ونمود سے دور، گوشہ گیر، خودداری اور حق گوئی کی مثال۔

جائسی صاحب کی تاریخ پیدائش ۱۶/نومبر ۱۹۳۶ء ہے، رائے بریلی کے قصبہ جائس سے شاید ہی کوئی اہل علم ناواقف ہو، اودھ کے دیگر مردم خیز قصبات کی طرح اس قصبہ کی خاک میں بھی شہیدان جستجو کا لہو کچھ اس طرح شامل ہوا کہ اس کے ذروں کا بھی چمکنا جیسے مقدر کر دیا گیا، کبیر صاحب کا مولد یہی جائس ہے لیکن تربیت اور پرورش سب کی سب اعظم گڑھ شہر کے حصہ میں آئی، جہاں ان کے والد ایک سرکاری عہدے دار کی حیثیت سے مقیم تھے، گھر اور محلّہ کی مسجد میں ناظرہ اور ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ شبلی کالج کے طالب علم ہوئے، ۱۹۵۶ء میں غالباً وہ انٹر کے آخری سال میں تھے کہ ان کے ایک سینئر نے ان کا ذکر ان الفاظ میں کیا کہ وہ

(کبیر صاحب) ایک نئی زندگی، نئی قوت حیات اور نئے زاویہ نظر کے مغنی ہیں، اٹھتی ہوئی ذہانت اور سوجھ بوجھ اور فکر و تامل ان کا طرہ امتیاز ہے، ممکن ہے یہ الفاظ اس وقت مبالغہ آمیز نظر آئے ہوں لیکن زمانہ نے بتایا کہ یہ تعارف کس درجہ صحیح اور واقعی تھا، شبلی کالج کے بعد انہوں نے حصول علم کے مراحل مسلم یونیورسٹی میں طے کیے، فارسی زبان میں ایم اے کرنے کے بعد ۱۹۷۳ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری وہیں سے حاصل کی، تعلیم کے یہ مرحلے طے ہوئے تو تدریس کی ذمہ داریوں سے آشنا ہوئے اور اسی آشنائی میں ساری عمر گزری، کبھی جامعہ ملیہ میں کبھی کشمیر میں اور بالآخر مسلم یونیورسٹی میں جہاں وہ مختلف اعلیٰ مناصب پر فائز رہ کر ۱۹۹۶ء میں رسمی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوئے لیکن علم و ادب کی خدمت کو جو لو لگی وہ آخر تک اپنا اثر دکھاتی رہی۔ اس کی پہلی جھلک تو اسی وقت نظر آ گئی تھی جب انہوں نے شبلی کالج کے زمانہ تعلیم میں کالج کے میگزین کے ذریعہ مولانا عبدالسلام ندوی نمبر مرتب کیا جو آج تک مولانا ندوی کے متعلق معلومات کا بہترین ذریعہ ہے، اسی زمانہ تعلیم کی ایک اور یادگار ان کی پہلی کتاب نقوش فانی ہے، فارسی ادبیات کے ذوق و تعلق نے ان کے قلم سے ایرانی تصوف، چند ایران شناس، ایران کی چند اہم تفسیریں، حافظ شخص اور شاعر، تاریخ ادبیات تاجکستان، تاجیکی ادبیات کے بانی، جدید تاجیکی شعراء، آذری، سوویت تاجیکی ادبیات کے بانی جیسی معلومات افزا کتابیں لکھوائیں، تاجیکی ادب کے تعارف میں ان کو اردو ادب میں انفرادی حیثیت ملی، یہ سب تو اردو میں ہیں، فارسی زبان میں مثنوی ناہید و اختر بھی ان کی علمی فتوحات میں شامل ہے، یہ ایک نایاب مثنوی ہے جس کو ایک عمدہ مقدمہ کے ساتھ مرتب کر کے انہوں نے ایران کو ہندوستانی فارسی کے ایک شاعر سے متعارف کرایا، اقبال ان کے پسندیدہ شاعر تھے اور یہ ان کی سلامت طبع کی دلیل ہے اسی لیے انہوں نے فارسی کی ایک کتاب علامہ اقبال مصلح قرن آخر اور تاجیکی زبان کی کتاب محمد اقبال کو اردو میں منتقل کر کے اقبالیات کے خزانہ کو اور پرثروت بنایا، علی گڑھ میں انہوں نے رسالہ تہذیب الاخلاق کی ادارت کی اور مجلّہ فکر و نظر کی مجلس ادارت میں شامل رہے، ان کی خدمات بلکہ کارناموں کا اعتراف کسی درجہ میں کیا بھی گیا، ہندوستان میں سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ، میر ایوارڈ، غالب ایوارڈ ملے اور صدر جمہوریہ کی جانب سے سند توصیف بھی ملی، پاکستان میں نقوش ایوارڈ اور ایران میں سعدی ایوارڈ

سے بھی نوازے گئے لیکن ہمارے نزدیک اصل ایوارڈ وہ ہے جو ان کو مولانا عبدالسلام ندوی کے تعلق کی شکل میں ملا، مولانا مرحوم سے وہ اعظم گڑھ کے قیام میں اتنے متاثر ہوئے کہ یہ تاثر عقیدت میں ڈھل گیا، وہ جہاں بھی رہے مولانا کی شفقتوں اور کرم فرمائیوں میں رطب اللسان رہے، ساہتیہ اکیڈمی نے جب مولانا عبدالسلام ندوی پر ایک کتاب کی اشاعت کا ادارہ کیا تو بجا طور پر اس کی نگاہ انتخاب جائسی صاحب پر پڑی اور یہ کتاب شائع بھی ہوئی، جائسی صاحب سمیناروں میں شرکت سے عموماً اجتناب کرتے تھے لیکن عبدالسلام ندوی صاحب کی یاد میں سمینار خواہ ممبئی میں ہو یا بلریا گنج میں وہ بڑے شوق سے شامل ہوتے اور عام وخاص ہر نشست میں اپنے سننے والوں کے سامنے اپنے استاد کامل صاحب اقبال کامل کی یادوں کے پھول بکھیرتے رہتے۔ ان کا حافظہ ایسا طاقت ور تھا کہ ماضی کی ہر بات ان کی یاد میں زندہ وتازہ رہتی، شاید اسی وجہ سے ان کے خاکوں میں ''جوڈھونڈو گے انہیں'' کے نام سے شائع ہوا ایک عجیب زندہ فضا نظر آتی ہے، کئی ملاقاتوں میں انہوں نے اس راقم کو ہدایت کی کہ دارالمصنّفین کے جن بزرگوں کو دیکھا ہے، ان کے حالات لکھو، قربت خدا جانے کتنی ایسی حقیقتوں کے اظہار کا سبب بنتی ہے جو دور رہنے والوں کے لیے اصل شخصیت کی معرفت کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے، اس مختصر تذکرہ سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ زندگی کی ان کی راہ گذر آسان ہی تھی لیکن یہ سفر اتنا آسان نہیں رہا، خصوصاً اہلیہ مرحومہ کی علالت اور پھر موت اور سب سے بڑھ کر مابعد موت، کبیر صاحب پر جو گزری، کہیں انہوں نے یہ بپتا لکھی بھی ہے اور کون ہے جو اس کو پڑھ کر اپنے آنسوؤں پر قابو پا سکے، جن حالات سے وہ گزرے کس سے اس کا بیاں کرتے، ہاں ایک خود کلامی کا سہارا تھا، اس لیے صبا جائسی کے پردے میں جو دل پہ گزرتی رہی، اسے رقم کرتے رہے

نہ قافلہ، نہ غبار سفر، نہ سایہ کوئی ہمارے ساتھ تو جو کچھ تھا، دامن تر تھا
وہی خاموش سا خود اپنے سے الجھا الجھا دیکھنا غور سے یارو وہ صبؔا ہے شاید
جی جانتا ہے ہم پہ جو گزری ہر اک قدم آنے کو آ گئے ہیں تری رہ گزر سے ہم

انہوں نے شروع میں فانی کی شاعری کو اپنا محور بنایا تھا، کیا خبر تھی، صحرا صحرا اور جاوداں مضراب میں فانی کے ثانی بن جائیں گے، سخن فہمی کے ساتھ سخن گوئی کی یہ نعمت کم ہی ملتی ہے، اردو

کے علاوہ انہوں نے فارسی میں بھی طبع آزمائی کی، رنگ وہی جوار دو کا تھا

سکوں نا آشنا ، دائم خراماں عجب چیزیست ، ایں مشت غبارم
ہمہ شب نیم سوزاں می زیم من منم گویا چراغ رہ گذارم

لیکن وہ اس حوصلے کے تھے کہ ہر رات گر چہ بے کراں درد کے مانند ہوتی ، وہ سحر کی توقع پر زندگی کے نغمے گاتے رہے۔مجلسوں میں وہ زندگی کے نمایندہ بن کر موجود رہتے ، زندہ دل ،شگفتہ رو ، بے ساختہ ، برجستہ ، بےتکلف ، بے باک ، بے ریا۔نوحہ تو اسی بات کا ہے کہ آہستہ آہستہ ایسے لوگ اٹھتے جاتے ہیں اور زبان حال سے کہتے جاتے ہیں کہ

ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

اللہ تعالیٰ ان کی خوبیوں اور نیکیوں کو قبول فرمائے ، لغزشوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرما کر ان کو اپنی رحمت کا مستحق بنادے۔

ع-ص

باب التقریظ والانتقاد

رسالۂ والدیہ

جناب حسن بیگ

رسالۂ والدیہ کا پس منظر: خواجہ عبیداللہ احرار مشہور نقش بندی صوفی ہیں (۸۰۴تا۸۹۵ھ-۱۴۰۴تا۱۴۹۰ء)۔ان کی منفرد شخصیت کا پندرہویں صدی عیسوی کے ترکستان میں غیر معمولی اثر تھا۔ نہ صرف ترک، تاجیک، مغل اور ازبک اس میں شامل تھے بلکہ تیموری سلاطین بھی ان کے زیر اثر تھے۔ظہیر الدین بابر کے دادا ابوسعید مرزا تو ان کے اس قدر معتقد تھے کہ امور سلطنت میں بھی ان سے مشورہ کیا کرتے تھے۔

خواجہ احرار نے اپنے والد محمود شاشی کے کہنے پر ایک مختصر رسالہ طالبان حق کی ہدایت کے لیے فارسی نثر میں تحریر کیا، اس میں انہوں نے نقش بندی طریقے کے اصول بیان کیے، مذہب کے احکامات پر سختی سے کاربند رہنے کو روحانیت حاصل کرنے کا ذریعہ بتایا اور کسی قسم کے غیر شرعی کام جیسے سماع وغیرہ سے دور رہنے کی ہدایت کی ہے۔ چونکہ انہوں نے یہ رسالہ والد کے کہنے پر رقم کیا اس لیے اس کا نام رسالۂ والدیہ پڑ گیا۔

ظہیر الدین بابر کو اپنے دادا، والد اور چچا سے خواجہ احرار کے تعلقات کا علم تھا، بابر خود بھی خواجہ احرار سے انتہائی عقیدت رکھتا تھا۔۹۰۴ھ-۱۵۰۰تا۱۵۰۱ء میں اس نے خواجہ کو خواب میں دیکھا کہ وہ اس کے لیے فتح سمرقند کی خوش خبری لائے ہیں۔سال ۹۳۵ھ/۱۵۲۸ء میں آگرہ قیام کے دوران بابر کو مسلسل بخار رہنے لگا، اس سے نجات کے لیے بابر کے دل میں خیال آیا کہ جس طرح شرف الدین بوصیری (۶۰۸تا۶۹۴ھ-۱۲۱۴تا۱۲۹۴ء) نے مصر میں قصیدہ بردہ لکھ کر اپنے فالج سے نجات پائی تھی اسی طرح میں بھی رسالہ والدیہ کو ترکی زبان میں نظم کرکے اپنے مرض

اسکاٹ لینڈ۔

سے چھٹکارا پاؤں ۔ چنانچہ اس نے اس رسالہ کو نظم کرنا شروع کیا اور خود اس کے مطابق جلد ہی مرض سے افاقہ پالیا۔(۱)

اردو ترجمہ رسالۂ والدیہ: ظہیر الدین بابر کی رحلت کے ۴۸۱ سال بعد مغلیہ ورثے کی زبان، اردو میں آخر کار رسالۂ والدیہ کا ترجمہ شائع ہو گیا۔ یہ ترجمہ حال ہی میں پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی نے ڈاکٹر انصار زاہد خان کی تنقیح و ترتیب کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اس کا انگریزی زبان میں ترجمہ پہلے ہی کئی دفعہ ہو چکا ہے، لیکن اردو ترجمے کی یہ پہلی اشاعت ہے۔ اس کے لیے مرتب دلی مبارک باد کے مستحق ہیں ۔ یہ اردو میں ایک سنگ میل ہے۔ پاک و ہند میں اب فارسی زبان کے لکھنے اور پڑھنے والے کم ہیں لیکن ترکی زبان کے تو نایاب ہیں ۔ اس اردو ترجمے پر دو ترکی عالموں ڈاکٹر عبدالسلام اور ڈاکٹر محمد صابر نے کام کیا اور اس دوران ہی دونوں کا انتقال ہوا۔ اس کے علاوہ مختار احمد کاشف صاحب بھی اس کا فارسی نثر سے اردو نثر میں ترجمہ کرنے کے بعد جاں بحق ہوئے۔ یہ ناقابل تلافی نقصانات ہیں۔

خواجہ احرار کے متعلق پہلے مترجم ڈاکٹر عبدالسلام نے اپنے مقدمے میں تحریر کیا ہے کہ وہ سید گھرانے میں پیدا ہوئے ، خواجہ کا لقب مختلف ادوار میں ، اطراف و اکناف اسلامی ممالک ، مختلف شخصیتوں کے لیے استعمال ہوتا رہا ہے ، جس میں سوداگر، تاجر، آقا، عارف کامل سب ہی شامل ہیں، ترکستان میں یہ لقب اولاد حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ و حضرت علیؓ (وہ اولاد جو حضرت فاطمہؓ کے علاوہ بیویوں سے تھی) کے لیے مستعمل ہے (۲)۔ کیونکہ خواجہ احرار نہ صرف عارف کامل تھے، ان کے اجداد میں حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ دونوں شامل ہیں (۳) اور ان کا پیشہ تجارت تھا، اس لیے انہیں خواجہ اور ان کی اولاد کو خواجہ زادے کہا جاتا ہے۔ (۴)

عبدالسلام نے ان مشائخ کے ناموں میں جن سے خواجہ احرار نے فیضان صحبت حاصل کیا، خواجہ بہاء الدین کو بھی شامل کیا ہے، اس سے یہ تاثر پیدا ہوسکتا ہے کہ یہ خواجہ بہاء الدین نقش بندی ہیں ، اصل میں یہ ایک دوسرے خواجہ بہاء الدین عمر ہیں جن کا قیام ہرات میں تھا (۵)۔ اسی مقدمے میں دو جگہ عبدالسلام نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ بابر کا بخار غالباً ملیریا تھا۔ ملیریا میں بخار عام طور پر ایک دن بیچ آتا ہے۔ اگر ہم بابر کی بیماریوں کو ایک تسلسل کے ساتھ دیکھیں، امراض کی

شکایات اور علامات پر غور کریں تو اس میں کوئی شک نہیں رہتا کہ یہ ایک ۹۳۴ھ سے لاحق بیماری تھی جو بار بار عود کر آتی تھی اور جس نے اس کو آخری پانچ سالوں میں صاحب فراش رکھا۔ ایک صحت مند انسان جو دو آدمیوں کو بغل میں دبا کر آگرہ فصیل پر دوڑ سکتا تھا، اس قدر کمزور ہو گیا کہ اس کی عمر پچاس سال بھی نہ ہو سکی۔ (۶)

خواجہ احرار اور ان کے احباب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے سینکڑوں خطوط آج بھی موجود ہیں، مجموعہ مراسلات کا قلمی نسخہ تاشقند میں ہے اس کے متعلق عبدالسلام نے لکھا ہے کہ یہ خواجہ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ ان خطوط کا اب تفصیلی مطالعہ ہو گیا ہے، یہ ۴۹۴ خطوط ہیں اور اس کے سولہ مختلف لکھنے والوں کی نشان دہی ہو گئی ہے (۷)۔ اس میں نہ صرف خواجہ خود بلکہ ان کے قریبی رشتہ دار، مرید اور ساتھی شامل ہیں۔

رسالۂ والدیہ پر ایک مفصل تحقیقی مقالہ لاس اینجلز کے پروفیسر اے جے ای بودرولی جیتی نے ۱۹۸۴ میں برلن سے شائع کیا، میری نظر میں پروفیسر اے جے بودرولی کی تحقیق کی اتنی اہمیت نہیں جتنی اہمیت اس کو عبدالسلام دیتے ہیں، کیونکہ بقول عبدالسلام خود انہوں نے والدیہ کے نفس مضمون کو سمجھا ہی نہیں۔ ان کی غلطیاں فاش ہیں۔ انہوں نے اس رسالہ کے مضمون کو صرف پیروی رسول سمجھا اور کہا کہ ولی بلند سے بلند درجات پاتے ہوئے رسول کے برابر ہو جاتا ہے، رسالہ میں صوفیہ کے عقائد، اخلاق اور اشغال کو اہمیت نہیں دی۔ اس لیے ان کی تحقیق قابل اعتماد نہیں۔

ڈاکٹر عبدالسلام، بابر کی زبان کو چغتائی ترکی کہنا پسند کرتے ہیں۔ روسی مستشرقین اس کو پرانی ازبک زبان کہتے ہیں، ڈاکٹر محمد صابر دوسرے ترکی داں ہیں جنہوں نے عبدالسلام کے بعد رسالہ پر کام کیا، انہوں نے اس سلسلے میں کوئی حتمی رائے نہیں دی اور کہا کہ ترکی ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کو اس سلسلے میں کام کرنا چاہیے۔ بابر خود اپنی زبان کو ترکی کہتا ہے، عام شہری اور بازاری لوگوں میں کوئی ایسا نہیں جو ترکی نہ جانتا ہو (۸)۔ یہ سوال بار بار آتا ہے کہ ازبکستان کے رہنے والوں اور ان کی زبان کو کیا نام دیا جائے؟ ازبکستان روس کے دور حکومت میں قائم کیا گیا، اس سے پہلے یہ سب ترکستان تھا۔ بابر کی نظر میں ازبک غیر ملکی اور غاصب تھے جو دشت قبچق سے حملہ آور ہوئے، انہوں نے ترک علاقوں پر دست درازی کر کے قبضہ کیا (۹)۔ مجھے وقائع بابر

کی تیاری کے سلسلے میں وسط ایشیا جانے کا اتفاق ہوا ، ازبکستان ، تاجکستان ، کرغیزستان اور ترکمانستان کے سفر میں ترکوں سے ملاقات کرنے پر اندازہ ہوا کہ لوگ سب ایک ہی ہیں، زبان کے تلفظ، لہجے اور الفاظ میں تھوڑا بہت اختلاف ہے۔ یہ اسی طرح ہے جیسے اردو زبان میں۔ پنجاب اور بہار کی اردو میں فرق محسوس کیا جاتا ہے۔ ازبک ایک قبیلہ اور قوم ہے، زبان اور ملک نہیں۔ اس لیے پورے علاقے کی زبان کو ترکی ہی کہنا چاہیے۔

عبدالسلام کے حواشی میں مرتب ڈاکٹر انصار زاہد خاں، جن کی محنت سے اس رسالہ نے اشاعت کی شکل دیکھی ، اس میں اضافہ کیا ہے (نوٹ۲) کہ رسالۂ والدیہ کا فارسی متن اور خواجہ عبیداللہ کے خطوط کا مجموعہ ایران سے شائع ہو چکا ہے۔ فارسی متن یقیناً ایران میں اشاعت پذیر ہوا لیکن خواجہ احرار کے خطوط کا مجموعہ لائیڈن ، نیدرلینڈ سے انگریزی میں شائع ہوا ہے (۱۰)۔ اس کے مرتب جواین گراس اور عاصم اورن بیو ہیں۔

ڈاکٹر صابر نے ترکی متن اور اس کے اردو ترجمے کا تنقیدی اور تفصیلی جائزہ نہیں لیا، صرف یہ لکھا ہے کہ پہلا بامحاورہ اردو ترجمہ ہے جن حضرات نے والدیہ پر کام کیا ان میں عبدالسلام و محمد صابر ہی دو حضرات تھے جو دونوں زبانوں سے واقف تھے، ان کے تاثرات قیمتی ہوتے۔

ڈاکٹر صابر نے انصارالدین ابراہیمو اور سعید حسن بیگ کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ بابر شناس ازبکستان کی شخصیتیں ہیں ، انصارالدین کا حال ہی میں تاشقند میں انتقال ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جوار رحمت میں جگہ دے۔ سعید حسن بیگ ایک ترکی بابری عالم ہیں جنہوں نے رسالۂ والدیہ اور وقائع بابر کے ترکی تنقیدی متن کریلیک رسم الخط میں شائع کیے ہیں۔ یہ اردو اور انگریزی زبان سے ناواقف ہیں، میری ان سے کئی ملاقاتیں رہی ہیں لیکن زیادہ تفصیلی اور علمی بات چیت نہیں ہو سکی۔

ظہیر الدین بابر کو ازبکستان میں عام طور پر اور فرغنہ کے لوگ خاص طور پر اپنا قومی ہیرو تسلیم کرتے ہیں۔ تاشقند میں میوزیم میں ایک بابری گوشہ ہے، جو امیر تیمور میوزیم کا حصہ ہے۔ اندجان میں باغ بابر ہے جو کئی طبقوں پر ہے، اس میں ایک کتب خانہ اور ہال ہے جہاں مجالس ہوتی ہیں۔ ہال کے پیچھے بابر کی ایک مصنوعی قبر تعمیر کی گئی ہے جس کے لیے اندجان کے ایک سابق مئیر اور بابری تحریک کے روح رواں ذاکر جان مشرب کابل سے مزار بابر کی مٹی لے

کرآئے تھے۔

ڈاکٹر صابر نے صفحہ ۳۷ اور ۴۰ پر آئی جی مانو کے کلکٹڈ ورکس کا مبہم ذکر کیا ہے۔ یہ حال ہی میں مشتہر شدہ مجموعہ بابری تصانیف ہے جس کی اس جاپانی محقق نے نشان دہی کی ہے، آئی جی مانو نے کہیں والدیہ رام پور کے دونسخوں کا ذکر نہیں کیا۔نوٹ ۱۹ میں انہوں نے یہ کہا کہ ڈاکٹر ایو بی کا تنقیدی متن مجھے مشیتا کی مدد سے حاصل ہوا جو علی گڑھ، انڈیا میں پڑھ رہے ہیں (۱۱)۔رام پور مجھے بھی جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ڈاکٹر صدیقی ڈائریکٹر نے ہی مجھے والدیہ کی کاپی مرحمت فرمائی تھی۔انہوں نے کسی بھی دوسرے مخطوطہ والدیہ کا ذکر نہیں کیا۔اسی سلسلے میں یہ پہلو افسوس ناک ہے کہ سلطنتی کتب خانہ ایران کے مخطوطہ وقائع بابر کا ذکر سب سے پہلے لاہور میں ہوا، نہ صرف اس پر توغان، ایک ترکی عالم نے اپنا مضمون پڑھا بلکہ یہ اورینٹل کالج میگزین میں اشاعت پذیر بھی ہوا تھا (۱۹۵۹ء) لیکن اس کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔(۱۲)

رسالۂ والدیہ کی اس اردو اشاعت کے ایک باب کلام ملوک میں مرتب ڈاکٹر انصار زاہد خان نے بابر کی شاعری کے ارتقاء کا عمدہ جائزہ پیش کیا ہے۔جس طرح حالات و واقعات نے بابر کی شاعری کو متاثر کیا، یہ اس کا ایک عمدہ آئینہ ہے۔اس میں مرتب نے ۹۳۵ھ کی ضیافت کا ذکر کیا ہے جو بابر نے اپنے فتح ہندوستان کے بعد کی اور اس میں ہندوستان وافغانستان وترکستان سے مہمانوں نے شرکت کی۔اس میں خواجہ عبیداللہ احرار کے خانوادے کے خواجہ عبدالشہید، خواجکا خواجہ (خواجہ عبداللہ کے بیٹے اور خواجہ عبیداللہ کے پوتے)، خواجہ کلاں (بن خواجہ عبدالباقی بن خواجہ محمد یحییٰ بن خواجہ احرار) شامل ہوئے (۱۳)۔اس میں خواجہ یحییٰ شامل نہیں تھے کیونکہ ان کو شیبانی خاں ازبک نے ۹۰۶ھ میں قتل کروادیا تھا۔بابر نے جو اشعار ہمایوں کو بادشاہت کی بندشوں سے متعلق تحریر کیے تھے وہ مرتب نے صفحہ ۶۹ پر دیے ہیں، ان سے یہ غلط تاثر پیدا ہوسکتا ہے کہ یہ بابر کے اشعار ہیں، پہلے دو شعر نظامی گنجوی (۱۴) اور آخری شعر شیخ سعدی کا ہے (۱۵)۔وہ اشعار مندرجہ ذیل ہیں:

جہاں گیری توقف بر نیابد
جہاں آن را بود کو باشتابد

ہمہ ہر چیز زروئی کد خدائی
سکوں می یابد الا پادشاہی (نظامی)
اگر پای بندی رضا پیش گیر
وگر یک سواری سر خویش گیر (سعدی)

بابر کی ایک اور تصنیف مبیّن ہے، رسالۂ والدیہ کو کسی بھی طرح بابر کی مثنوی مبین سے جوڑا نہیں جا سکتا، سوائے اس کے کہ دونوں بابر کی تصانیف ہیں۔ مبین میں دو ہزار اشعار ہیں۔ یہ فقہ بابری کہلاتی ہے کہ بابر نے اس میں اصول فقہ، نماز، روزہ، زکوۃ وغیرہ کے احکامات نظم کیے ہیں۔ یہ کامران بن بابر کی اصلاح کے لیے لکھے گئے تھے جو کابل میں بابر کی غیر موجودگی میں کابل کا حکمراں تھا۔ مبین بھی اب شائع ہوگئی ہے ۔(۱۶)

ترکی متن والدیہ میں بابر نے کئی جگہ لفظ بیعیت استعمال کیا ہے (شعر ۳۲)، ڈاکٹر عبدالسلام نے بعض جگہ اس کو اردو میں اسی طرح رہنے دیا ہے جس سے ترجمے کی زبان ثقیل ہوگئی ہے، دوسری جگہوں پر اس کا ترجمہ پیروی (شعر ۷۰) اور اتباع کیا ہے (شعر ۷۱)۔ اسی طرح اور بھی الفاظ ہیں جن کے اردو میں عام فہم متبادل مل سکتے تھے، جیسے اتصالی (شعر ۱۲۳)، مسجود (شعر ۱۶۱) اور منتجی (شعر ۱۹۲)، شعر ۱۳۸ کے متعلق نوٹ ہے کہ کشتن کو کشش کے معنی میں لیا گیا ہے، لیکن کشتن ترکی متن میں نہیں ہے۔

میری نظر میں رسالۂ والدیہ میں خواجہ احرار کی تصویر اور اصل فارسی متن کی کمی رہی۔ بابر کی تصویر بھی بڑی اور واضح ہونی چاہیے تھی۔

مجھے خوشی ہے کہ ترکی، فارسی اور اردو الفاظ کی حرف خوانی پر محنت کی گئی ہے، مرتب اور ناشر اس سلسلے میں مبارک باد کے مستحق ہیں لیکن پھر بھی اغلاط سے کلی فراغت نہیں ملی۔ خاص طور پر شعر ۱۴ پر سرّ کی جگہ ستر اور شعر ۱۹۲ میں بولغای کی جگہ تولغای ہونا چاہیے تھا۔

کیا وجہ ہے کہ ہم نے مغرب کو عربی ہندسوں سے متعارف کرایا لیکن آج بھی ہم کتاب کے صفحات اردو (عربی) ہندسوں میں نہیں دیتے؟

حواشی

(۱)ظہیرالدین بابر، وقائع بابر، شہر بانو پبلی شرز، کریکاڈی، ۲۰۰۷ء، ص ۳۱۰۔(۲)اردو دائرہ معارف اسلامیہ لاہور، ج ۹، ص ۲۰۔(۳) عارف نوشاہی، خواجہ احرار، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۸۱۔(۴)حکیم بدرالدین، بدرالدجیٰ، مصلح المطابع، دہلی، ۱۹۰۰ء، ص ۲۱۸۔(۵) ایضاً ۳، ص ۸۶۔(۶)حسن بیگ، بابر کے امراض کا طبی تجزیہ، وقائع بابر، شہر بانو پبلی شرز، کریکاڈی، ۲۰۰۷ء، ص ۳۴۵۔(۷) جواین گراس، عاصم اورن بیو، دی لیٹرز آف خواجہ عبیداللہ احرار اینڈ ہز ایسوسی ایٹس، برل، لائیڈن، ۲۰۰۲ء، ص ۶۹۔(۸)ظہیرالدین بابر، وقائع بابر، شہر بانو پبلی شرز، کریکاڈی، ۲۰۰۷ء، ص ۱۔(۹) ایضاً ص ۳۵۸۔(۱۰) ایضاً ص ۵۔(۱۱) آئی جی مانو، دی کلکٹڈ ورکس آف بابر پری زروڈ ایٹ سلطنتی لائبریری ان تہران، نوٹ ۱۹، ص ۱۹۷۔(۱۲)حسن بیگ، وقائع بابر، شہر بانو پبلی شرز، کریکاڈی، ۲۰۰۷ء، ص (ز) حاشیہ۔(۱۳) ایضاً ص ۳۱۵۔(۱۴) نظامی گنجوی، دکتر معین فر، انتشارات زرین، سال اشاعت درج نہیں، ص ۱۸۱۔(۱۵) سعدی شیرازی، غلام عباس ماہو، مکتبہ دانیال، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۳۰۔(۱۶) اورل سیہان، ہمین درفقہ، چاگری بانیلری، استنبول، ۲۰۰۴ء۔

ادبیات

نعت

جناب وارث ریاضی صاحب

آئینہ دارِ نور مجسم تمہیں تو ہو
دنیائے رنگ و بو میں مکرم تمہیں تو ہو
تم سا کوئی حسیں کہیں دیکھا نہیں گیا
نقش و نگارِ خالقِ عالم تمہیں تو ہو
سوز حیات و گرمیِ تمکین کائنات
قلب گداز و دیدۂ پرنم تمہیں تو ہو
ہے جس کے دم سے گلشنِ کونین کی بہار
وہ آب روئے گوہرِ شبنم تمہیں تو ہو
اے جلوہ زارِ محفلِ عرفان و آگہی
اسرارِ کائنات کے محرم تمہیں تو ہو
جس نے دیا جہاں کو حیات آفریں پیام
وہ صاحبِ صحیفۂ محکم تمہیں تو ہو
فرسودہ تھا نظام جہانِ خراب کا
جس نے کیا حسین و منظّم تمہیں تو ہو
جس نے کیا ہے وارثؔ ناداں کو باشعور
وہ روحِ علم و عقلِ مجسم تمہیں تو ہو

کاشانۂ ادب، سکٹا دیوراج، بسوریا، وایا لوریا، مغربی چمپارن، بہار، ۸۴۵۴۵۳۔

نعت

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی

مرتکز انؐ پہ کیوں نہ ہو ، میری نگاہِ انتخاب
جن کے ظہور سے ملا ، عالمِ پیر کو شباب

آپؐ کے فیض سے ملی ، ذہنِ بشر کو روشنی
دور ہوئے تمامتر ، فکر و نظر کے اضطراب

انؐ کی پیروی میں ہے ، دونوں جہان کی فلاح
ہٹ کر نبیؐ کی راہ سے کون ہوا ہے کامیاب

ظرف و نظر کی بات ہے ، جتنا جو فیضیاب ہو
سیرتِ سید الرسلؐ ، سب کے لیے ہے الکتاب

کیسے تھے خوش نصیب جو ، دیکھ سکے رخِ حبیبؐ
سامنے جس کے ماند تھی ، تابشِ ماہ و آفتاب

شہرِ رسولِ پاکؐ کے خار بھی گل سرشت ہیں
کیسے لبھائے پھر مجھے ، ہند کا مزرعِ گلاب

رٹتے ہو نامِ مصطفیٰؐ ، کرتے ہو پیروی غیر
حشر کے روز ظالمو! دوگے خدا کو کیا جواب؟

جن کی سمجھ سے دور ہے ، فرقِ خدا و مصطفیٰؐ
لیں خبر اپنے دین کی ، ان کا عقیدہ ہے خراب

دشمنِ دین ہی نہیں ، دشمنِ عقل بھی ہے وہ
جس کے لبوں پہ نعت ہے ، ہاتھ میں بربط و رباب

''قُرَّةُ عَيۡنِیۡ فِی الصَّلٰوۃ'' قولِ رسولِ پاکؐ ہے
خاکِ سجود ہے رئیسؔ ، چہرۂ زندگی کی آب

پوسٹ بکس نمبر ۱۱۴، علی گڑھ، ۲۰۲۰۰۱۔

مطبوعات جدیدہ

قرآن مجید انسانی زندگی کا رہبر کامل : از جناب مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۳۶۸، قیمت: ۳۵۰ روپے، پتے: مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ندوۃ العلماء لکھنؤ، مکتبہ اسلام گوئن روڈ امین آباد لکھنؤ، الفرقان بک ڈپو نظیر آباد لکھنؤ اور لکھنؤ کے دوسرے مکتبے۔

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ آخری کتاب ہے، اس ایمان کے ساتھ یہ یقین بھی ہر صاحب دل اور صاحب عقل کی زبان پر آنے کے لائق ہے کہ یہ تمام گذشتہ صحیفوں کے مقابلہ میں زیادہ جامع اور ہر انسانی ضرورت کے گوناگوں تقاضوں کو احسن طریق سے پورا کرنے کا اہل ہے، ایک اور بات جو اس کتاب کے فاضل اجل مصنف نے خاص طور پر کہی وہ یہ ہے کہ قرآن مجید صرف عبادت ہی کی ہدایت کے لیے محدود نہیں بلکہ انسان اور اس کے خالق کے مابین ربط وتعلق کی ہر امکانی حالات وصلاحیت کی حیثیت سے زندگی کے تمام عقائد واعمال میں ایسی رہنمائی کی گئی ہے جس میں انسان کی فطرت، مزاج اور ضرورت کا پورا لحاظ رکھا گیا، یہ کتاب اسی یقین کی ایسی جامع تشریح اور ایسا مدلل بیان ہے جس کا اندازہ اس کے مضامین کی فہرست سے ہی ہو جاتا ہے، جس کے گیارہ ابواب، احد عشر کوکبا کی طرح مختلف عنوانوں میں ایسے ضیا پاش ہے کہ کوئی گوشہ بھی روشنی سے محروم نہیں، علم، انسان، خالق کائنات کی تابع داری، انبیائے کرام جیسے ابواب کے تحت بیش قیمت مضامین کے بعد قرآن کتاب ہدایت اور پھر قرآن مجید کے فضائل، علوم ومباحث، اعجازی خصوصیات، تعلیمات، نبی آخر الزماں کا مقام، حسن سیرت، اخلاق حسنہ جیسے عنوانات کے ذیل میں خود قرآن مجید کے براہ راست حوالے سے سارے مضامین آگئے ہیں، مصنف فاضل گرامی کی عمر ہی قرآن مجید کی تعلیم وتدریس میں گزری، ان کی ادیبانہ شان، عربی میں بھی مسلم ہے، دقیق سے دقیق مضمون کو آسانی سے ذہن اور دل میں اتارنے کی خوبی ان کی تقریر وتحریر کا سب سے بڑا امتیاز ہے، یہ کتاب اسی خوبی کا ایک اور خوبصورت ترین آئینہ ہے، ایک اور اس لیے کہا گیا کہ اس سے پہلے سیرت کے موضوع پر رہبر انسانیت کے نام سے استاذ الاساتذہ کی ایک اور بیش قیمت کتاب سامنے آچکی ہے، پرخلوص لہجے اور نہایت سلجھے کلامی اسلوب اور سب سے بڑھ کر انسانی فلاح کی چاہت نے مولانا مدظلہ کو خود رہبری کے لیے میر کارواں کا مقام عطا کیا ہے، رہبر انسانیت اور زیر نظر رہبر کامل کو پیش کرنے

کی رہبرانہ خدمت یقیناً ان کو زیبا ہے۔ کم کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو عوام وخواص دونوں کے لیے یکساں ضروری اور مفید ہوں، ایسی ہی کتابوں میں اس قابل قدر کتاب کا شمار کیا جائے گا۔

۴۸ سال شفقتوں کے سائے میں : از جناب مولانا سعید الرحمٰن الاعظمی ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۸۷۲ ، قیمت: ۳۵۰ روپے، پتہ: مکتبہ فردوس مکارم نگر لکھنؤ اور لکھنؤ کے دیگر مکتبے۔

اس کتاب کے مصنف عربی اور اردو زبانوں میں یکساں قدرت اظہار کے لیے ذوالریاستین کے منصب پر ہی فائز نہیں، درس وتدریس، تحریر وتقریر اور بے شمار علمی وعملی کارناموں کی وجہ سے بجا طور پر دور حاضر کی جامع کمالات شخصیتوں میں ممتاز مقام کے حامل ہیں، مردم خیزی میں مشہور شہر ہنروراں مئو کی بے شمار سعادتوں میں اس کتاب کے رسم بامسمی فاضل جلیل مصنف کا وجود بھی ہے، سولہ سترہ سال کی عمر میں ان کی زندگی کا وہ دور شروع ہوا جب وہ دارالعلوم ندوہ سے وابستہ ہوئے اور قسام ازل نے اس وابستگی میں ایسی برکت دی کہ ندوہ اور یہ فرزند ندوہ دونوں ایک دوسرے کے لازم وملزوم بن گئے، قریب نصف صدی گزر گئی اور ربط وتعلق بلکہ عشق وعقیدت کی یہ داستان ہر روز دراز تر ہونے کے ساتھ اور بھی دلآویز اور حسین تر ہوتی گئی، لیکن اس دلآویزی اور دلکشی کا اصل منبع حسن کون ہے؟ اس کتاب میں اس کا اظہار جس نفاست سے کیا گیا ہے وہ اردو کے سوانحی ادب میں ایک انفرادی شان کا اظہار ہے ان ہی کو سب پکار اٹھیں گزر جاؤں جدھر ہو کر اپنی زندگی کی داستان میں ممدوح ومرشد ومربی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی یادوں کے امتزاج نے استاذ وشاگرد اور مرشد ومسترشد دونوں کے سوانحی کا لطف دوبالا کر دیا، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے کاروان حیات میں وہ اس طرح شامل ہوئے کہ ان کی زندگی کی ہر یافت اور ہر منزل اسی کارواں کی حدی خوانی میں ان کی خوش نصیبی کا حصہ بنتی گئی۔ واقعی یہ ایک شجرہ طیبہ کے سایے میں عطر آگیں، خوش رنگ اور خنک احساس ہے، لگتا ہے، ایک مسافر ہے اور میدانوں، صحراؤں، آبشاروں، کوہستانوں اور نشیب وفراز والی وادیوں سے گزرتی ہوئی گاڑی کی کھڑکیوں سے ایک چاند ہے جو اسی تیزی سے فضا کی بیکراں وسعتوں سے مسافر کے وجود کو اپنی چاندنی سے سرشار کیے جاتا ہے، کتاب کا سرورق کچھ اسی جانب اشارہ کرتا ہے، کتاب کی دلکشی میں ایک اضافہ مولانا خالد سیف اللہ کا خوبصورت مقدمہ بھی ہے۔

مکتوبات ماجدی (جلد ہفتم) : مرتبہ پروفیسر ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی، متوسط تقطیع، بہترین

کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۴۲۲، قیمت: ۳۰۰ روپے، پتہ: اپلائیڈ بکس پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس ۳/۳۹/۱۷، بیسمنٹ نیو کوہ نور ہوٹل، پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کا انتقال ۷۷ء میں ۷/ جنوری کو ہوا تھا، ان کی وفات کے بعد ان کی کتابوں اور مضامین کے مجموعوں کے عمدہ ایڈیشن چھپتے رہے، ان میں سب سے زیادہ اہم مولانائے محترم کے مکتوبات کے مجموعے ہیں، چھ جلدوں میں یہ مجموعے ۸۲ء سے ۲۰۱۰ء تک کلکتہ کے ادارہ انشائے ماجد نے شائع کیے اور ان سب کو مرتب کرنے کی عظیم خدمت مولانا مرحوم کے نامور برادرزادہ اور خویش ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی کی قسمت میں آئی، زیر نظر جلد ہفتم بھی ڈاکٹر صاحب کی محنت اور حسن ترتیب کا نتیجہ ہے اور دیگر مجموعوں کی طرح یہ بھی ان کے مفید اور پراز معلومات حواشی سے آراستہ ہے، پیش لفظ میں اس کی دو خصوصیتیں بیان کی گئی ہیں، پہلی تو یہ کہ دوسری جلدوں کی بہ نسبت اس جلد کے مکتوب الیہم کی تعداد سب سے زیادہ ہے، دوسرے یہ کہ ۱۹۵۳ء سے پہلے کے خطوط جو دستیاب ہوئے وہ بھی اس میں شامل ہیں، مولانا دریابادی کے اس وصف میں کم ہی مشاہیر شامل ہیں کہ ان کے حلقۂ تعارف و تعلق میں زندگی کے مختلف طبقات کی شمولیت اپنی کثرت اور وسعت کے لحاظ سے بے مثال ہے، اس مجموعہ میں چورانوے مکتوب الیہم ہیں، مولانا اسعداللہ سہارن پوری سے وارث کامل بجنوری تک کیسے کیسے اصحاب علم و فضل و کمال ہیں، گنجائش ہوتی تو ان سب کا نام ضرور لیا جاتا، مولانا تھانوی، اچاریہ ونوبا بھاوے، فراق، چودھری رحم علی الہاشمی، تقی امینی، احمد جمال پاشا، مولانا مجیب اللہ، مولانا اسحاق سندیلوی، ضیاءالدین بدایونی، ابوالوفا افغانی، اے کے بردہی، صالحہ عابد حسین، تاراچند، مجذوب، شائستہ اکرام، ریاض الرحمٰن خاں شروانی، پروفیسر نذیر، حکیم عبدالحمید، وحید مرزا، گوپی چند نارنگ، شوکت تھانوی، مسعود حسن رضوی ادیب، کس کس کا نام لیا جائے، ان خطوط میں وہ سارے رنگ شامل ہیں جن سے انشائے ماجدی کے حسن کو دوام ہے، مولانا کی شخصیت جس طرح ان خطوط میں جلوہ ریز ہے، وہ مطالعات ماجدی کے لیے سب سے قیمتی دولت ہے، سب سے زیادہ خطوط مولانا شمس تبریز خاں کے نام ہیں، جن کا کچھ دنوں پہلے انتقال ہوا، ان کے نام اور جناب سخی احمد ہاشمی کے نام خطوط میں خاص طور پر علامہ شبلی کا ذکر ہے، کاش ان سطروں میں اس کی جھلک پیش کرنے کی گنجائش ہوتی۔ ویسے بھی اصل لطف تو براہ راست مطالعے میں ہے، حسن طباعت کے لحاظ سے یہ جلد گذشتہ تمام حصوں سے فائق ہے، کتابت کی غلطیاں نہیں کے برابر ہیں لیکن المامون کے پہلے ایڈیشن کا سال طباعت غلطی سے ۱۹۸۷ء لکھا گیا ہے۔ ع-ص

رسید مطبوعہ کتب

۱-**التفسیر کراچی (شخصیات نمبر)**: ڈاکٹر محمد شکیل اوج، مجلس التفسیر، B-3، اسٹاف ٹاؤن یونیورسٹی کیمپس، جامعہ کراچی، کراچی۔ قیمت: ۳۰۰ روپے۔

۲-**الثورۃ الہندیہ، باغی ہندوستان**: علامہ فضل حق خیرآبادی، ترجمہ وسوانح مولانا عبدالشاہد خان شروانی، المجمع الاسلامی، مبارک پور، اعظم گڑھ یوپی۔ قیمت: درج نہیں۔

۳-**بنیاد کا پتھر**: مولانا عبدالقیوم حقانی، القاسم اکیڈمی، جامعہ ابوہریرہ، خالق آباد نوشہرہ، پاکستان۔ قیمت: درج نہیں۔

۴-**جنگ اور جہاد**: مولانا ارشد جمال، نورانی بک ڈپو، دال منڈی، بنارس۔ قیمت: درج نہیں۔

۵-**حیات العلماء**: مولف مولانا سید عبدالباقی سہسوانی، ترتیب وتدوین حنیف نقوی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، اردو بھون، انسٹی ٹیوشنل بھون امیر جسولہ، نئی دہلی۔ قیمت: ۶۳ روپے۔

۶-**رسول اکرمؐ کی رضاعی مائیں**: ڈاکٹر پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی، مکتبۃ الفہیم، مئوناتھ بھنجن۔ قیمت: ۷۵روپے۔

۷-**سیرت نبویہ قرآن مجید کے آئینہ میں**: مولانا محمد اسجد قاسمی، اسلامی بک فاؤنڈیشن، ۱۷۸۱، حوض سوئیوالان، نئی دہلی۔ قیمت: ۷۵روپے۔

۸-**قرآن اور انسانی حقوق**: محمد اختر مسلم، محمد ایوب، ایم ارشاد چودہری، ایڈوکیٹ، لاہور۔ قیمت: ۲۰۰ روپے۔

۹-**قرآنی افکار وتعلیمات اور موجودہ دور میں ان کی معنویت**: ظفر الاسلام اصلاحی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲۔ قیمت: ۱۰۰روپے۔

۱۰-**قرآنی مقالات (ماہنامہ الاصلاح کے منتخب قرآنی مضامین)**: مرتبہ اشتیاق احمد ظلی، ادارہ علوم القرآن، پوسٹ بکس ۹۹، شبلی باغ علی گڑھ۔ قیمت: ۲۵۰روپے۔

۱۱-**کنز الاطفال**: محمد صدیق پٹنی ندوی، مکتبہ الحرم، خان جہاں مسجد، جمال پور، احمد آباد۔ قیمت: ۵۰ روپے۔

۱۲-**معاشی مسائل اور قرآنی تعلیمات (مقالات سمینار)**: مرتبین اوصاف احمد، عبدالعظیم اصلاحی، ادارہ علوم القرآن، پوسٹ بکس نمبر ۹۹، شبلی باغ علی گڑھ، یوپی۔ قیمت: ۱۶۰ روپے۔

۱۳-**مکتوبات شبلی**: مرتبہ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ، اعظم گڑھ، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔ قیمت: ۲۵۰روپے۔

۱۴-**نکات الحق**: تصنیف حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ، ترجمہ ڈاکٹر محمد عارف الدین شاہ فاروقی قادری ملتانی، اسلامک بک سنٹر، مسجد چوک، حیدرآباد۔ قیمت: ۱۰۰روپے۔

۱۵-**یادگار مجلہ سمینار تعلق بالقرآن، اہمیت اور تقاضے**: جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ۔ قیمت: درج نہیں۔